مواعظ حکیم الامتؒ اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ
الامداد
لاہور
پاکستان

مدیر مسئول
مشرف علی تھانوی

مدیر
خلیل احمد تھانوی

شمارہ ۷	ربیع الاول ۱۴۲۱ھ / جون ۲۰۰۰ء	جلد ۱

وعظ

الاستقامت

از افادات: حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

عنوانات و حواشی: مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ ۱۰/= روپے ○ زر سالانہ ۱۰۰/= روپے

پتہ دفتر
ماہنامہ الامداد
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ
۲۹۱ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
فون نمبر
۵۴۲۲۲۱۳-۴۴۸۰۶۰

ناشر:- مشرف علی تھانوی
مطبع:- ہاشم اینڈ حماد پریس
۱۳/اے سٹریٹ ۲۱، فردوس پارک لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ لاہور پاکستان

الاستقامت

۵- جمادی الاخری سنہ ۱۳۴۰ھ بعد از نماز جمعہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے "استقامت" کے بارے میں یہ بیٹھ کر اڑھائی گھنٹے تک بیان فرمایا۔

سامعین کی تعداد ۲۵ تھی۔

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے قلم بند فرمایا۔

جس قدر دعوت الی اللہ اور اعمال صالحہ اور انشراح باظہار العبدیت میں ترقی ہوگی۔ اسی قدر ان ثمرات میں ترقی ہوگی۔ پھر ان ثمرات عالیہ کے لیے ترقی کی طلب کیوں نہ ہو؟ ضرور ہونا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ ترقی کے ذرائع بھی میسر ہوں۔

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشاں ست

خم و خمخانہ با مہر و نشاں ست

(از حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

الاستقامت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ و نستغفرہ ونؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم ۔

اما بعد :

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ ان لاتخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ۔ نحن اولیاءکم فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون نزلاً من غفور رحیم ۔ و من احسن قولا ممن دعاالی اللہ و عمل صالحا وقال اننی من المسلمین ۔ ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ

ط ادفع بالتی ھی احسن ج فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم . وما یلقھا الا الذین صبروا وما یلقٰا الا ذو حظ عظیم . واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انہ ھوالسمیع العلیم .(۱)

تمہید

آج کے بیان کی کوئی خاص ضرورت معتد بہ محض استحسان(۲) کے درجہ میں بیان ہورہا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے بعض مہمان مستورات کی درخواست پر گھر میں وعظ ہوا تھا۔ یہاں کے لوگوں کو (یعنی خانقاہ والوں کو) اس کی اطلاع نہیں ہوئی یا ہوئی۔ مگر وقت پر اطلاع ثانی(۳) کے منتظر رہے اور اطلاع وقت پر کی نہیں گئی۔ اس لیے شریک نہ ہوسکے۔ اور میں نے وقت پر قصداً اطلاع(۴) نہیں کی۔ کیوں کہ اسے بعض لوگ یہ سمجھ جاتے ہیں۔ کہ شرکت کی طلب یا درخواست

---

(۱) بعد خطبہ ماثورہ۔ پس میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں شیطان مردود سے۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں۔ جن لوگوں نے اقرار کرلیا ہے کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت پر خوش رہو جس کا تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے اور تمہارے لیے اس میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمہارے لیے اس میں جو مانگو گے موجود ہے یہ بطور مہمانی کے ہوگا غفور رحیم کی طرف سے اور اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو خدا کی طرف سے لائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجیے پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہوجائیگا جیسے کوئی دلی دوست ہوتا ہے اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجیے بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ سورہ حم سجدہ آیت ۳۰ تا ۳۶ (۳) دوسری اطلاع (۴) جان بوجھ کر

ہے جس سے بعضے اپنے کاموں کا حرج کر کے شرماشرمی شریک ہوتے ہیں اور دن بھی تعطیل[۵] کا نہ تھا- اس لیے اکثر اپنا حرج[۶] ہی کر کے آتے- ان وجوہ سے میں نے اطلاع نہیں کی- پھر مجھے معلوم ہوا کہ ختم وعظ پر جب یہاں خبر ہوئی- کہ آج گھر میں وعظ تھا- تو سب کو افسوس ہوا- تو میں نے خیال کر لیا تھا- کہ اس کی تلافی قریب ہی زمانہ میں کسی دن کردوں گا- چنانچہ آج جمعہ تھا- تو ارادہ ہوا کہ آج اس قرض کو ادا کروں-

اوراس کا مقتضا[۷] یہ تھا- کہ آج بھی وہی بیان ہوتا- جو زمانہ[۸] میں ہوا تھا یا ان ہی آیات کا بیان ہوتا- گو مضمون یا عنوان دوسرا ہوتا- مگر اس مضمون کا بعینہٖ[۹] اعادہ تو اس لیے نہ کیا- کہ وہاں مستورات کا مجمع تھا- وہاں ان کے مناسب مضمون اختیار کیا گیا تھا اور عنوان بھی ان کے مناسب تھا- مگر اتفاق سے مضمون ایسا بیان ہوا جو مردوں کی بھی ضرورت کا تھا- کیوں کہ بجز[۱۰] خاص خاص مسائل کے اکثر مسائل مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں- اس لیے مضمون تو وہی بیان ہوگا- مگر عنوان دوسرا ہوگا- جو اس مجمع کے مناسب ہوگا-

اور آیات کا اعادہ[۱۱] اس لیے نہ کیا کہ اس وقت اسی مضمون کے متعلق دوسری آیات ذہن میں آگئیں جن میں اس مضمون کی تکمیل تھی- کیونکہ قرآن کے مضامین ملتے جلتے ہیں- چنانچہ حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں- کتاباً متشابھاً اس لیے ایک مضمون کے لیے چند در چند آیتیں پڑھی جا سکتی ہیں- بس میں نے پہلی آیات کا اعادہ مناسب نہ سمجھا- بلکہ جب اس مجمع کی خصوصیت سے عنوان بدلا گیا- تو آیات بھی دوسری اختیار کی گئیں-

---

(۵) چھٹی (۶) نقصان (۷) اس وعدہ کا تقاضا یہ تھا (۸) گھر میں
(۹) بالکلیہ (۱۰) سوائے (۱۱) وہی آیات دوبارہ اس لیے نہیں پڑھیں

میں نے پہلے یہ بیان کیا تھا کہ نبوت تو ختم ہو چکی ہے۔ مگر ولایت نہیں ختم ہوتی۔ اور ولایت ہر شخص کو اسلام کی برکت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ آج میں اسی مضمون کو دوسرے عنوان سے بیان کرتا ہوں وہ ہے استقامت کہ لازم ولایت ہے۔ دشوار نہیں، بلکہ سہل[۱۳] ہے اور یہ ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے اور جو لوگ استقامت کو دشوار[۱۴] سمجھتے ہیں اس کا منشاء افراط و مبالغہ ہے[۱۵]۔

فضائل ایمان

تعیین مضمون کے بعد اب تفسیر آیت شروع کرتا ہوں - ان آیات میں اصل مقصود فضائل ایمان کا بیان ہے۔ مگر اس کے لیے کچھ شروط[۱۶] ہیں جن میں سے بعض پر نفس ایمان موقوف ہے[۱۷] اور بعض پر کمال ایمان موقوف ہے[۱۸] ان شروط کو بھی یہاں پیش کیا گیا ہے۔

ماقبل سے ان آیات کا ربط[۱۹] یہ ہے کہ اس سے پہلے حق تعالیٰ نے کفار کی بدحالی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے یہ آیات ہیں۔

وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھذاالقرآن والغوافیه لعلکم تغلبون . فلنذیقن الذین کفروا عذاباً شدیداً ولنجزینّهم اسوأ الذی کانوا یعملون . ذلک جزآء اعدآء

(۱۳) مشکل نہیں بلکہ آسان ہے (۱۴) دین پر مستقل مزاجی سے عمل کرنے کو مشکل سمجھتے ہیں (۱۵) اس کی وجہ کمی و زیادتی ہے (۱۶) شرطیں (۱۷) یعنی اگر وہ شرط نہ پائی جائیگی تو ایمان ہی نہ رہیگا (۱۸) اس شرط کے نہ پائے جانے کی صورت میں ایمان تو ہوگا لیکن کامل نہیں ہوگا (۱۹) پچھلی آیات سے ان آیات کا تعلق یہ ہے

اللّٰہ النار ۚ لهم فيها دار الخلد ط جزآءً بما كانوا بايتنا يجحدون . وقال الذين كفروا ربنا ارنا الذين اضلّنا من الجن والانس نجعلهما تحت اقدامنا ليكونا من الاسفلين[۳۰].

ترجمہ:- اور یہ کافر (باہم یوں کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنو ہی مت اور (اگر پیغمبر سنانے لگیں تو) اس کے بیچ میں غل مچادیا کرو شاید (اس ترکیب سے) تم ہی غالب رہو (اور پیغمبر ہار کر چپ ہو جاویں) سو (اس نالائق حرکت اور ایسے ارادہ کے بدلہ میں) ہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھاویں گے اور ان کو ان کے) برے برے کاموں کی سزا دیں گے۔ یہی سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی۔ یعنی دوزخ ان کے لیے وہاں ہمیشگی کا مقام ہوگا اس بات کے بدلہ میں کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے اور (جب مبتلائے عذاب ہوں گے تو) وہ کفار کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو وہ دونوں شیطان اور انسان دکھلا دیجیے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا۔ ہم ان کو اپنے پیروں کے تلے مل ڈالیں تا کہ وہ خوب ذلیل ہوں۔

کفار کی بدحالی[۳۱] بیان فرما کر حق تعالیٰ مسلمانوں کی خوش حالی بیان فرماتے ہیں۔ جس کے ساتھ ایمان کے فضائل اور اخلاق جمیلہ[۳۲] کی تعلیم بھی مذکور ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی عادت ہے۔ کہ کفار اور مومنین کی حالت ساتھ ساتھ بیان فرماتے ہیں۔ کبھی اوّل مومنین کی حالت بیان ہوتی ہے۔ تو اس کے بعد ساتھ ہی کفار کا حال بھی مذکور[۳۳] ہوتا ہے۔ اور کبھی برعکس[۳۴] - تاکہ ترغیب و ترہیب دوش بدوش[۳۵] رہیں - بعبارت دیگر یوں[۳۶] کہیے۔ تاکہ جمال و جلال

---

(۳۰) سورہ حم سجدہ آیت ۲۶ تا ۲۹ (۳۱) بری حالت (۳۲) عمدہ اخلاق (۳۳) ذکر کیا جاتا ہے (۳۴) کبھی اس کے خلاف کہ کفار کے حال کے بعد مسلمانوں کا حال ذکر کرتے ہیں (۳۵) تاکہ رغبت اور ڈراو ساتھ ساتھ ہو (۳۶) دوسرے لفظوں میں

کی تجلی ساتھ ساتھ ہوتی رہے۔ اس سے اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔

اس کے متعلق میں اپنا ایک امر وجدانی عرض کرتا ہوں[۲۷]۔ مجھے چند روز سے یہ بات محسوس ہوتی ہے اور بچپن سے بھی مجھے اس کا احساس تھا۔ مگر اب چند روز سے زیادہ احساس ہے۔ کہ مجھے قرآن کے دو صفحوں پر تو نور سا محسوس ہوتا ہے اور اس کے بعد دو صفحے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے ان پر سایہ پڑا ہوا ہے۔ مثلاً سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی چند آیات شروع کے دو صفحوں پر ہیں مجھے یہ زیادہ روشن محسوس ہوتی ہیں اور اس کے بعد کے دو صفحے ایسے ہیں۔ کہ گویا ان پر ظل[۲۸] پڑا ہوا ہے۔ اسی طرح سارے قرآن میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

چند روز سے مجھے اس کی علت یہ ذہن میں آئی[۲۹] کہ یہ جمال و جلال کی صورت منکشف ہوتی[۳۰] ہے۔ کیونکہ قرآن میں ترغیب و ترہیب ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ تو جہاں ترغیب ہے وہاں تجلی جمالی ہے[۳۱]۔ جو زیادہ واضح ہے اور جہاں ترہیب ہے وہاں تجلی جلالی ہے[۳۲]۔ جو کسی قدر ستر وحجاب لیے ہوئے ہے۔ خواہ کوئی اسے میرا وہم سمجھے۔ مگر میرے خیال میں یہی آیا ہے۔ واللہ اعلم۔

چنانچہ اس مقام پر پہلے جلال کا ذکر ہے۔ اب اہل جمال کا ذکر ہے کہ جن لوگوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس پر قائم رہے۔ ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے آتے ہیں کہ ڈرومت اور اس جنت کے ساتھ خوش رہو۔ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

---

(۲۷) ایک ایسی بات عرض کرتا ہوں جو میں نے محسوس کی ہے (۲۸) سایہ (۲۹) اس کی وجہ یہ سمجھ میں آئی (۳۰) اللہ تعالیٰ کی صفت جمال اور صفت جلال روشنی اور سایہ کی صورت میں نظر آتی ہے (۳۱) جہاں کسی کام کے کرنے کی رغبت دلائی گئی ہے تو وہ اللہ کی صفت جمال کا مظہر ہے (۳۲) جہاں عذاب سے ڈرایا گیا ہے وہ صفت جلال کا اظہار ہے

مبالغہ فی التقوی[۳۳]

اب سمجھنا چاہیئے- کہ یہاں استقامت سے کیا مراد ہے۔ بعض لوگ اس کی تفسیر میں غلطی کرتے ہیں- جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اندر دو مرض ہیں- افراط، تفریط[۳۴]- اہل تفریط نے استقامت کی تفسیر میں بھی تفریط کی ہے اور اہل افراط نے اس کی تفسیر میں غلو کیا[۳۵] ہے- پس ہم کو اپنے اندر اعتدال پیدا کر کے اپنی اصلاح کرنا چاہیئے۔ ہر چند کہ افراط و تفریط دونوں مذموم[۳۶] ہیں- مگر افراط زیادہ مذموم[۳۷] ہے- کیونکہ اہل تفریط تو اپنی کوتاہی[۳۸] کو اکثر سمجھتے بھی ہیں- گو سستی ہی کی وجہ سے کوتاہی کریں اور ان کو اپنی غلطی پر بھی تنبہ ہو جاتا ہے[۳۹]- کیونکہ وہ اپنے علم و عمل کو ناقص[۴۰] سمجھتے ہیں- مگر اہل افراط اپنے افراط کی غلطی پر متنبہ نہیں ہوتے[۴۱]- کیونکہ وہ افراط کو محمود اور کمال تقویٰ سمجھے ہوئے ہیں[۴۲]- اور چونکہ اکثر افراط اعتقادی[۴۳] میں زیادہ مبتلا ہیں- اسی لیے بعض لوگ استقامت کا نام سن کر یہ سمجھے ہوں گے- کہ استقامت کوئی بڑی دشوار[۴۴] چیز ہے- جس کی وجہ وہی ہے- کہ بہت لوگ تقویٰ میں مبالغہ کرتے ہیں اور وہ اسی کو استقامت سمجھتے ہیں اور اس کو محمود[۴۵] سمجھتے ہیں اور بظاہر یہ محمود معلوم بھی ہوتا ہے- مگر حقیقت میں محمود نہیں[۴۶]- کیونکہ مبالغہ کی وجہ سے کسی وقت یہ شخص مایوس بھی ہو جاتا ہے- کیونکہ اس کے نزدیک تقویٰ کا جو اعلیٰ

---

(۳۳) تقوی میں زیادتی کرنا
یعنی غلو (۳۴) کمی و زیادتی (۳۵) حد سے نکل گئے ہیں (۳۶) کمی زیادتی دونوں برے ہیں (۳۷) مگر زیادتی کرنا زیادہ برا ہے (۳۸) کمزوری (۳۹) اپنی غلطی سے باخبر ہو جاتے ہیں (۴۰) نا مکمل (۴۱) مگر زیادتی کرنے والے اپنی غلطی سے آگاہ بھی نہیں ہوتے (۴۲) تقوی کا کمال اور پسندیدہ سمجھتے ہیں (۴۳) اکثر لوگ زیادتی کے اعتقاد میں مبتلا ہیں (۴۴) مشکل (۴۵) اچھا (۴۶) اچھا نہیں

درجہ[۴۷] ہے۔ اس کی تحصیل دشوار[۴۸] ہے اور ادنیٰ درجہ کو یہ ناکافی سمجھتا ہے۔ اس لیے اخیر میں اس کو مایوسی ہوجاتی ہے۔ جس کا انجام تعطّل[۴۹] ہے۔

مثلاً بعض واعظوں سے لوگوں نے تقویٰ کے قصے سنے ہوں گے اور ہم نے بھی بچپن میں ایسے قصے دیکھے ہیں۔ جیسے ایک شخص کا قصہ ہے۔ کہ وہ طعام حلال[۵۰] کی تلاش میں کسی بزرگ کے پاس آیا اور کہا۔ میں آپ کے پاس طعام حلال کی طلب میں آیا ہوں۔ یہ سن کر وہ رونے لگے اور فرمایا کہ ہاں اب تک تو میرا کسب حلال تھا[۵۱]۔ مگر اب نہیں رہا۔ کیونکہ ایک دن میرے بیل دوسرے شخص کے کھیت میں چلے گئے تھے۔ اس کی مٹی بیلوں کے پیر کو لگ گئی اور میرے کھیت میں مل گئی۔ اب مجھے شبہ ہوگیا ہے۔ ایسے قصے سن کر لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ بس تقویٰ بہت دشوار ہے[۵۲]۔ حالانکہ یہ قصہ شریعت کے بھی بالکل خلاف ہے۔ اور عقل کے بھی۔

عقل کے خلاف تو اس لیے کہ بیلوں کے پیر کو جو مٹی لگ جاتی ہے وہ تھوڑی دور چلنے سے جھڑ جاتی ہے۔ تو کیا یہ ضرور ہے۔ کہ دوسرے کے کھیت کی مٹی اس کے کھیت میں مل گئی ہو۔ پھر اگر دوسرے کے کھیت کی مٹی ان کے کھیت میں مل گئی ہو تو ایسے ہی ان کے کھیت کی مٹی اس کے کھیت میں جا ملی ہوگی تو برابر سرابر معاملہ ہوگیا۔ پھر اگر اتنی مٹی سے شبہ ہوجایا کرے تو چاہیئے کہ جانوروں کو ہر وقت بند رکھا جائے، کہیں چلنے پھرنے نہ دیا جائے۔ حالانکہ جانور بند نہیں رہ سکتے۔

اور شریعت کے خلاف اس لیے ہے کہ ماہران شریعت[۵۳] نے ایسے مبالغہ

---

(۴۷) سب سے بڑا درجہ
(۴۸) حاصل کرنا مشکل ہے (۴۹) عمل چھوڑ کر بیٹھ جانا (۵۰) حلال کھانے کی تلاش میں (۵۱) میری کمائی حلال تھی (۵۲) تقویٰ بہت مشکل ہے (۵۳) جو لوگ شریعت پر عمل کرنے والے ہیں یعنی ائمہ مجتہدین

کو قابل تعزیر[۵۴] سمجھا ہے۔ مثلاً کوئی شخص ایک دانہ گندم کی تعریف و تشہیر کرتا پھرے۔ کہ یہ دانہ کس کا ہے۔ تو فقہاء لکھتے ہیں کہ انہ یعزر[۵۵] اس شخص کو سزائے تعزیر دی جائے۔ کیونکہ شریعت نے اس قلیل مقدار کو قابل تعریف اور داخلہ لقطہ[۵۶] نہیں بنایا۔ کیونکہ یہ مال نہیں۔

اور حدیث میں جو حضور ﷺ کا ارشاد آتا ہے۔ کہ بعض دفعہ راستہ میں مجھے ایک چھوارہ پڑا ہوا ملتا ہے تو میں اس کو کھانا چاہتا ہوں۔ مگر اس خیال سے نہیں کھاتا۔ کہ مبادا صدقہ کا ہو (کیونکہ صدقہ آپ ﷺ کے لیے حرام تھا) جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ قلیل بھی مال ہے)[۵۷]

سو اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ایک چھوارہ عادۃً منتفع بہ[۵۸] ہے۔ اس لیے وہ مال ہے اور ایک دانہ گندم منتفع بہ نہیں[۵۹]۔ اس لیے وہ مال نہیں۔ غرض شریعت نے ایسی قلیل مقدار کو لقطہ نہیں بنایا اور یہ شخص اس کو لقطہ بناتا ہے۔ گویا یہ اپنی طرف سے نئی شریعت ایجاد کرتا ہے۔ اسی طرح اگر بیل کے پیر کو مٹی لگ جائے تو وہ کوئی قیمتی چیز نہیں۔ چنانچہ اتنی مٹی کی بیع[۶۰] جائز نہیں اور جب قیمتی نہیں تو اس کا ضمان بھی نہیں[۶۱]۔ پھر اس کے کھیت میں ملنے سے شبہ کیوں ہو گیا اور اگر بالفرض ضمان بھی لازم[۶۲] ہوتا تو اس کا ضمان ادا کر دینا کافی تھا۔ تم نے اپنے کھیت میں سے اتنی ہی مٹی دوسرے کے کھیت میں

---

(۵۴) سزا کے قابل (۵۵) اس کو سزا دی جائے (۵۶) لقطہ اس چیز کو کہتے ہیں کہ جو راستہ میں کسی کو پڑی ملے جس کا مالک معلوم نہ ہو تو اس کا حکم ہے کہ مالک کو تلاش کر کے پہنچائی جائے اور تلاش کے لیے حتی المقدور کوشش کی جائے جیسے اخبار میں اشتہار دینا ریڈیو وغیرہ پر اعلان جس حیثیت کی چیز ہو ویسا ہی اعلان کیا جائے مالک نہ ملے تو اس کی طرف سے صدقہ کر دے بے حقیقت چیز کو لقطہ نہیں کہتے جیسے گندم کا دانہ (۵۷) تھوڑا ہو تو بھی مال ہے (۵۸) ایک چھوارے سے بھی عادۃً فائدہ اٹھایا جاتا ہے (۵۹) ایک دانہ گندم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا (۶۰) خرید و فروخت (۶۱) اگر ضائع ہو جائے ڈانڈ بھی نہیں لیا جائیگا (۶۲) فرض کریں کہ ڈانڈ بھی ہو

ڈال دی ہوتی- اس سے کھیت کا غلہ اور پیداوار کیوں حرام ہو گیا- پس یا تو یہ قصہ موضوع ہے[۶۳]- یا یہ لوگ اہل حال ہیں- جو معذور ہیں یا وہ شریعت سے ناواقف ہوں گے- اس لیے ایسے اقوال حجت نہیں[۶۴] اور واعظوں کو ایسے قصے بیان کرنا جائز نہیں- اس قسم کے قصوں سے لوگ یہ سمجھ گئے- کہ تقویٰ بہت دشوار ہے اور جب تقویٰ اور استقامت حاصل نہیں ہو سکتی- کیونکہ حلال خالص مل نہیں سکتا تو-

چوں آب از سر گذشت
چہ یک نیزہ چہ یک دست[۶۵]

جب حرام کھانے سے مفر نہیں[۶۶] تو تھوڑا کھایا تب کیا بہت کھایا تب کیا- بس اب بے احتیاطی شروع ہو گئی- اول ایک بے احتیاطی ہوئی پھر دوسری، پھر تیسری، پہلے تو شبہات سے بچنے کا اہتمام تھا- اب حرام صریح سے بھی پاک نہیں یہ انجام[۶۷] ہے مبالغہ اور غلو کا-

حدودِ تقویٰ

اسی لیے شریعت نے غلو سے منع کیا ہے قرآن میں بھی امر[۶۸] ہے:-

لاتغلوا فی دینکم[۶۹].

(یعنی اپنے دین میں غلو نہ کرو) اور احادیث میں بھی اس کی سخت ممانعت ہے- من شاق شاق اللہ علیہ[۷۰].

---

(۶۳) گھڑا ہوا (۶۴) ایسے اقوال کو بطور دلیل پیش نہیں کر سکتے (۶۵) جب پانی سر سے اونچا ہو جائے تو چاہیے ایک ہاتھ اونچا ہو یا ایک نیزہ کیا فرق پڑتا ہے (۶۶) حرام کھانے سے بچ نہیں سکتے (۶۷) کوئی چارہ نہیں (۶۸) حکم ہے (۶۹) سورۃ النساء آیت ۱۷۱ (۷۰) جو سختی کرتا ہے اللہ اس پر سختی کرتے ہیں

کیونکہ اس میں حدود سے تجاوز ہے اور حدود سے تجاوز کرنا طاعت نہیں بلکہ معصیت ہے [۷۱]۔ صاحبو! شریعت نے ہر چیز کے حدود مقرر کیے ہیں۔ نماز کیسی اچھی چیز ہے۔ مگر اس کے لیے بھی حدود ہیں۔ کہ طلوع و غروب کے وقت نماز حرام ہے۔ مثلاً، پھر تقویٰ اور استقامت کے لیے حدود کیوں نہ ہوں گے۔ یقیناً اس کے لیے بھی ایک حد ہے۔ اس سے آگے جو تقویٰ ہو وہ ممنوع ہے۔ اسی واسطے شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

بزہد وورع کوش وصدق وصفا
ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ ﷺ

یعنی ایسا تقویٰ نہ کرو کہ حضور ﷺ سے بھی بڑھ جائے۔ یعنی ایسا غلو نہ کرو کہ ایسا تقویٰ کرنے لگو۔ کہ حضور ﷺ نے بھی ویسا تقویٰ نہ کیا ہو۔

حدیث میں حضور ﷺ کا دستور العمل تو یہ آیا ہے۔

ماخیر رسول اللّٰہ بین امرین الا اختار ایسرھما

کہ حضور ﷺ کو اگر ایک امر میں دو راستوں کا اختیار دیا جاتا تھا تو آپ سہل [۷۲] کو اختیار فرماتے تھے۔ یعنی طرق مقاصد [۷۳] میں مشقت کو اختیار نہ فرماتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس پر مشقت ڈالنا مطلقاً محمود [۷۴] نہیں۔ مگر بعض لوگ نفس پر مصیبت ڈالنے ہی کو مقصود سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ صورت اشد کو ہی مطلقاً افضل سمجھتے ہیں۔ [۷۵]

---

(۷۱) عبادت نہیں بلکہ گناہ ہے (۷۲) آسان (۷۳) مقاصد کے طریقوں میں سے (۷۴) اپنے آپ کو ہر کام میں مشکل میں ڈالنا بالکلیہ اچھا نہیں (۷۵) جس صورت میں مشقت زیادہ ہو اسی کو اچھا خیال کرتے ہیں

چنانچہ ایک صاحب اسی خیال کے تھے وہ کہتے تھے کہ جس عمل میں مشقت ہو وہی افضل ہے۔ میں نے کہا یہ مطلقاً نہیں۔ بلکہ مقاصد کے ساتھ مخصوص ہے اور پھر اس کے بھی حدود ہیں اور وسائل میں تو سہل صورت مطلقاً افضل ہے[۷۶]۔ وہ نہ مانتے تھے۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ پھر وضو کے لیے پانی لانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تھانہ بھون کے کنویں سے لایا جاوے۔ دوسرے یہ کہ جلال آباد و لوہاری[۷۷] سے لا جاوے تو آپ یہاں سے پانی لے کر وضو نہ کریں۔ بلکہ جلال آباد یا لوہاری سے لائیں۔ کیونکہ اس میں مشقت ہے اور مشقت کا کام افضل ہے اس مثال کے بعد انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ پس یاد رکھو۔ کہ مشقت مطلقاً اجر نہیں۔

بعض صحابہؓ نے ایک دفعہ اعمال شاقہ[۷۸] اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ایک نے کہا میں رات بھر نہ سویا کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں نکاح نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں عمر بھر گوشت نہ کھاؤں گا۔ اور ان سب نے حضور ﷺ کا طرز معتدل[۷۹] سن کر یہ بھی کہا کہ گو حضور ﷺ اتنی مشقت برداشت نہیں فرماتے۔ مگر آپ ﷺ کا مرتبہ بڑا ہے۔ آپ ﷺ کو اس کی ضرورت نہیں۔ ہم کو ضرورت ہے۔ اسی طرح ایک بار حضور ﷺ نے کسی رخصت پر عمل کیا۔ تو بعض صحابہؓ نے اس سے تنزہ کیا[۸۰] اور یہ سمجھا کہ حضور ﷺ کو عزائم پر[۸۱] عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ﷺ تو کمال کو پہنچ چکے ہیں۔ مگر ہم کو عزیمت ہی پر عمل کرنا چاہیئے۔ رخصتوں سے احتیاط کرنا

---

(۷۶) افعال دو قسم کے ہیں ایک وہ جو مقصود ہیں جیسے نماز ایک وہ جو اس مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ جیسے وضوء ان کو وسائل کہتے ہیں وسائل میں تو آسان صورت ہی اختیار کرنا افضل ہے (۷۷) جگہ کا نام ہے (۷۸) مشکل اعمال (۷۹) درمیانی طریقہ (۸۰) اس سے احتیاط کی (۸۱) افضل

چاہیے- حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی- تو آپ ﷺ کو سخت ناگواری ہوئی- فرمایا:

مابال اقوام یتنزھون مما اصنع وانا اخشاکم للہ و اتقاکم للہ.

لوگوں کا کیا حال ہے- کہ جو کام میں کرتا ہوں- وہ اس سے احتیاط کرتے ہیں- حالانکہ میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اور سب سے بڑھ کر متقی ہوں- غرض ہر چیز کے لیے حدود مقرر ہیں- جن سے آگے بڑھنا جائز نہیں- وسائط میں[۸۲] تو حدود کیوں نہ ہوں گے- جب کہ مقاصد میں بھی حدود ہیں- مقاصد ظاہری و موقت[۸۳] جیسے نماز روزہ میں تو سب کو معلوم ہے- مقاصد باطنی و مسترہ جیسے شوق و خوف[۸۴] ہیں- کہ مقصود ہیں اور جیسے ذکر لسانی ہیں کہ مقصود مستمر[۸۵] ان میں بھی تحدید ہے[۸۶]- مثلاً ذکر لسانی ہے- کہ غلبہ نعاس کے وقت اس میں سکوت مامور بہ ہے[۸۷]-

افراط کی خرابی

اور مثلاً شوق و خوف یہ مقاصد باطنہ میں سے ہیں- مگر احادیث سے غور کے بعد ان کے لیے بھی حدود معلوم ہوتے ہیں الحمدللہ حق تعالیٰ نے مجھے یہ علم عطا فرمایا ہے-

چنانچہ حدیث کے ایک جملہ سے میں نے خوف کی حد سمجھی ہے اور ایک

---

(۸۲) واسطوں میں
(۸۳) ایسے مقاصد جو ظاہر بھی ہیں اور ان میں وقت کی قید بھی ہے (۸۴) باطنی مقاصد اور ہمیشہ رہنے والے جیسے جنت کا شوق اور دوزخ کا خوف (۸۵) زبان سے ذکر الٰہی کرنا ہمیشہ مقصود ہے (۸۶) ان کی بھی ایک حد ہے (۸۷) مثلاً زبان کا ذکر ہے کہ اونگھ آرہی ہو تو اس میں خاموش ہوجانا افضل ہے

سے شوق کی حدیث میں آتا ہے۔

اللھم انی اسئلک من خشیتک ما تحول بہ بینی و بین معاصیتک .

آپ ﷺ دعا میں فرماتے ہیں کہ اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں۔ کہ جو میرے اور میرے گناہوں کے درمیان حائل ہوجائے۔ اس میں حضور ﷺ نے خوف کے لیے ایک حد بیان فرمائی ہے اور اسی حد کے موافق حصول خوف کی دعا ہے۔ حالانکہ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے۔ کہ جب خوف مقصود ہے تو جتنا زیادہ ہو اتنا ہی اچھا ہے مگر غور کرنے سے اس قید کا نفع[۸۸] یہ معلوم ہوا کہ اگر خوف حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ تو تعطل کا[۸۹] سبب ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اس کو رحمت الہی سے مایوسی ہوجاتی ہے اور خدا تعالی کی ناشکری تو ابتداء ہی میں ہونے لگتی ہے۔ جس شخص پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے وہ اپنے اعمال کو حقیر اور لاشئے سمجھتا ہے اور کہتا ہے۔ اجی! میں کیا نمازی ہوتا۔ میری نماز اور عدم[۹۰] نماز برابر ہے۔

بس وہ ایسی تواضع کرنے لگتا ہے۔ جیسے ہم نے سفر الہ آباد سے کانپور آتے ہوئے چند جنٹلمینوں کی تواضع دیکھی تھی۔ ریل میں میرا اور ان کا ساتھ ہوگیا۔ بڑے ہی چھچھورے اور پھکڑ تھے۔ بعضوں کی تہذیب محض ظاہری ہی ہوتی ہے۔ ان سب نے مل کر ایک ناآشنا منصف کو تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ اس کو بنانا شروع کیا۔ ایک نے دستر خوان بچھایا اور کہا آئیے منصف صاحب آپ بھی کچھ گو دموت

---

(۸۸) اس قید کا فائدہ کہ خوف میرے اور گناہوں کے درمیان حائل ہوجائے (۸۹) ترک عمل کا سبب بن جاتا ہے (۹۰) نماز پڑھنا نہ پڑھنا

کھالیجیے- دوسرے نے کہا توبہ کرو توبہ- کھانے کی بے ادبی کرتے ہو- کہنے لگا اس میں کھانے کی بے ادبی نہیں- بلکہ اپنی تحقیر ہے- اپنے کھانے کو کھانا کہنا تکبر ہے اپنی نسبت سے اس کو گوہ موت(۹۱) ہی کہنا چاہیے- مگر غنیمت ہے میرے حال پر انہوں نے عنایت رکھی-

ایک صاحب جو مجھ کو اسٹیشن پر پہنچانے آئے تھے- ان کو دھمکا گئے تھے- اس لیے مجھے تو کسی بات میں مخاطب نہیں کیا- اسی طرح زیادہ خوف والے اپنے اعمال کی بے قدری کرتے ہیں اور تواضع میں اپنی نماز روزہ کو بے کار و فضول کہتے ہیں- جیسے ان لوگوں نے تواضعاً کھانے کو گوہ موت کہا تھا- اے صاحب! اگر نماز کی آپ کو اتنی توفیق بھی نہ ہوتی- جواب ہو رہی ہے- تو بتلایئے کہاں جا کر سر پٹکتے- ع

بلا بودے اگر اینہم نبودے(۹۲)

صاحبو! اعمال کی بے قدری بری بلا ہے- اعمال فی نفسہٖ سب محمود و مقبول ہیں(۹۳)- ہاں ہماری حیثیت سے وہ کچھ بھی نہیں- مگر نعمت الٰہی ہونے کے اعتبار سے بڑی چیز ہیں- پھر اس بے قدری کا انجام یہ ہوتا ہے- کہ یہ شخص جب اپنے اعمال کو مغفرت کے لیے ناکافی سمجھتا ہے تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جاتا ہے- یہی تعطل ہے(۹۴)-

اور اسی طرح شوق میں حضور ﷺ نے حدود بیان فرمائی ہیں-

اللهم انی اسئلک شوقا الی لقائک فی غیر ضراء مضرة ولا فتنة مضلة .

---

(۹۱) پیشاب پاخانہ (۹۲) بڑی ہی مصیبت تھی اگر یہ توفیق بھی نہ ہوتی (۹۳) اعمال اپنی ذات کے اعتبار سے سب پسندیدہ اور اچھے ہیں (۹۴) بیکار بیٹھے رہنا اور عمل نہ کرنا

اس میں دو قیدیں ہیں۔ کہ اے اللہ مجھے ایسا شوق عطا ہو۔ جس میں ضراء مضرہ نہ ہو (یعنی ضرر ظاہری) اور فتنہ مضلہ نہ ہو (یعنی باطنی) کیونکہ غلبہ شوق میں کبھی جسم کو بھی ضرر پہنچ جاتا ہے۔ کہ شوق میں بے چین ہو کر گھلنے لگتا ہے اور باطنی ضرر بھی ہوجاتا ہے۔ کہ بعض لوگ حد ادب سے نکل جاتے ہیں۔ جیسے غلبہ شوق میں بعض عشاق محبوب کے پیروں میں گر پڑتے ہیں اور اس کی ٹانگ کھینچ لیتے ہیں۔ بعضے زبردستی اس کا ہاتھ کھینچ کر چومتے ہیں۔ بعض دفعہ باوجود کسی قابل نہ ہونے کے چند حالات و کیفیات عطا ہونے سے اپنے کو کامل سمجھنے لگتے ہیں۔

اہل اللہ ان واقعات کو جانتے ہیں۔ پھر حدود سے آگے نکلنے پر ان سے مواخذہ[۹۵] ہوتا ہے۔ اس وقت سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہماری فلاں حرکت کی سزا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے دعا کی۔ کہ اے اللہ میں تو دو روٹیاں اس وقت اور دو روٹیاں اس وقت مانگتا ہوں ۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا۔ بس ان پر یہ بلا نازل ہوئی۔ کہ چوروں کے ساتھ شبہ میں پکڑے گئے اور جیل خانہ میں دونوں وقت دو دو روٹیاں ملنے لگیں۔ بہت پریشان تھے۔ کہ کس گناہ میں پکڑا گیا۔ الہام ہوا کہ تم نے دو روٹیاں مانگی تھیں عافیت[۹۶] کی قید نہیں لگائی تھی۔ یہ اس کی سزا ہے۔ اب توبہ کی اور عافیت کی دعا کی۔ فوراً حاکم اعلیٰ کا حکم جیلر کے نام پہنچا۔ کہ فلاں شخص غلطی سے پکڑے گئے۔ فی الفور[۹۷] رہا کردیے جاویں۔ تب چھوٹے۔ بعض دفعہ تو قیود نہ لگانے پر مواخذہ ہوتا ہے۔ جب وہ ضروری ہوں اور بعض دفعہ قیود لگانے پر مواخذہ ہوتا ہے۔ جب وہ فضول ہوں۔

چنانچہ ایک صحابی زادے[۹۸] نے اس طرح دعا کی تھی۔ **اللهم انی اسئلک القصرالابیض عن یمین الجنه .**

---

(۹۵) پکڑ (۹۶) اطمینان (۹۷) فوراً (۹۸) صحابی کے بیٹے

(اے اللہ! میں سفید محل مانگتا ہوں۔ جو جنت کی دائیں طرف ہو) ان کے والد صاحب نے جو صحابی تھے فرمایا۔

یا نبی سل اللہ الجنۃ ولا تعتد فی الدعأ فانی سمعت رسول اللہؐ ان اللہ لا یجب المعتدین فی الدعاء.

(صاحبزادے! اللہ سے جنت مانگو اور دعا میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ دعاء میں حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتے تو دعا کے لیے بھی ایک حد ہے۔ شوق کے لیے ایک حد ہے۔

حدّ استقامت

اسی طرح استقامت کے لیے بھی ایک حد ہے۔ مگر بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی استقامت ہونا چاہئیے۔ ادنیٰ درجہ کی استقامت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نماز میں تطویل[99] کرتے تھے۔ جمعہ کی نماز میں بھی لمبی لمبی سورتیں پڑھتے تھے۔ جس سے لوگ دیر تک دھوپ میں جلتے تھے۔ ان کے نزدیک استقامت کا یہی درجہ مطلوب تھا۔ کہ نماز میں خوب تطویل ہو اور اس میں غلو یہ کیا۔ کہ جماعت میں بھی تطویل کرنے لگے۔ حالانکہ امام کو تخفیف[100] کا امر ہے۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ ایسی لمبی نماز سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ نماز مختصر پڑھانی چاہئیے تو آپ کیا فرماتے ہیں۔ کہ تم لوگ دھوپ سے ہی گھبرا گئے۔ تو جہنم میں کیسے رہو گے سبحان اللہ! آپ مسلمانوں کو جہنم کی گرمی سہنے کی مشق کراتے تھے۔

---

(۹۹) لمبی نماز پڑھتے تھے (۱۰۰) حدیث میں ہے کہ جو تم میں سے امام بنے تو ہلکی نماز پڑھائے یعنی زیادہ بڑی بڑی سورتیں نہ پڑھے

ایسے ہی ایک صاحب سجدہ میں اکیس بار سبحان ربی الاعلیٰ کہتے تھے۔ تو جو شخص ایسی نماز کو استقامت سمجھے گا۔ وہ اس سے کم کو نماز ہی نہ سمجھے گا۔ اس کا انجام یہ ہوگا۔ کہ اس کے پیچھے ایک دفعہ کوئی نماز پڑھ لے گا۔ تو پھر ہمیشہ کو چھوڑ دے گا اور خود اس شخص کو بھی اگر کسی وقت اس قدر اطمینان سے نماز پڑھنے کا موقعہ نہ ملے۔ مثلاً ریل میں اتنا اطمینان میسر نہیں ہوتا۔ تو اس حالت میں یہ نماز ہی کو چھوڑ دے گا۔ یہ خرابی ہے افراط و غلو کی اور جو شخص غلو نہ کرے گا۔ وہ ہر وقت جیسا موقعہ ہوگا۔ ویسی ہی جب رخصت شرعیہ [۱۰۲] نماز پڑھے گا۔ اس سے مقتدیوں کو بھی تکلیف نہ ہوگی۔ اور خود یہ بھی علم پر دوام کر سکے گا اور بڑی استقامت استدامت [۱۰۳] ہی ہے۔ کہ عمل پر دوام ہو اور یہ مبالغہ سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دوام ہمیشہ اعتدال سے حاصل ہوتا ہے۔

درجات استقامت

اب سمجھیے کہ استقامت کے چند درجے ہیں۔ ایک اعلیٰ ایک ادنیٰ۔ ایک متوسط، اور یہ قاعدہ عقلیہ مسلم ہے۔

لاتشکیک فی الماهیات .

حقائق و ماہیات میں تشکیک نہیں ہوتی۔ بلکہ تشکیک [۱۰۴] محض افراد میں ہوتی ہے۔ پس ہر درجہ حقیقت استقامت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اور جب استقامت ہر درجہ میں حاصل ہے۔ تو اس کی فضیلت بھی ہر درجہ میں حاصل ہے۔ جو لوگ استقامت میں غلو کرتے ہیں۔ وہ اس کو اعلیٰ درجہ میں منحصر کرتے ہیں [۱۰۵]

---

(۱۰۱) دین میں غلو یعنی زیادتی کرنے کی
(۱۰۲) جہاں جیسی شریعت نے رعایت دی ہوگی اس کے مطابق نماز پڑھ لے گا (۱۰۳) سب سے بڑی استقامت یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ عمل کرتا رہے (۱۰۴) شک نہیں ہوتا (۱۰۵) وہ سمجھتے ہیں کہ استقامت کو

گر یہ رحمت الٰہی کو تنگ کرنا ہے۔ حالانکہ خدائے تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ جیساکہ حدیث میں آتا ہے۔ کہ ایک اعرابی نے نماز کے بعد دعا کی۔

اللھم ارحمنی و محمداً

ولاتشرک فی رحمتنا احداً

یعنی اے اللہ! مجھ پر رحم کیجیے اور حضور ﷺ پر اور ہماری ساتھ رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کیجیے حضور ﷺ نے سن کر فرمایا۔

لقد تحجرت واسعاً۔

تو نے وسیع شئے کو تنگ کردیا۔ وہ بے پچارہ یہ سجھا ہوگا کہ سب پر رحمت ہوئی تو بٹتے بٹتے کم رہ جاوے گی۔

باقی حضور ﷺ کو بھی اس نے خاطر کی وجہ سے شریک کرلیا ہوگا کہ آپ ﷺ کی برکت سے تو ایمان ہی نصیب ہوا۔ آپ ﷺ کو تو شریک کرلینا چاہئیے۔ باقی اور سب کی صاف نفی کردی[۱۰۶]۔

مگر ان گاؤں والوں کی بے ادبی معاف ہے۔ کیونکہ وہ جاہل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک بدوی نے سورہ **والتین والزیتون** سنی تھی۔ اس کو خیال ہوا کہ حق تعالیٰ نے انجیر وزیتون کی قسم کھائی ہے تو یہ ضرور مزے دار ہوں گے۔ کھانا چاہئیے چنانچہ اول انجیر خریدا تو مزے دار تھا۔ کہنے لگا۔ صدقت ربنا۔ اے اللہ آپ نے سچ کہا۔ پھر زیتون خریدا اور اسے کچا ہی کھالیا۔ وہ بکٹا بکٹا تھا[۱۰۷]۔ تو کہنے لگا۔ واہ اللہ! میاں (نعوذ باللہ) چکھنے سے پہلے ہی قسم کھالی۔ یہ تو خدا کے ساتھ برتاؤ تھا اور حضور ﷺ کے ساتھ یہ برتاؤ تھا۔ کہ ایک دفعہ بہت سے اعرابی آپ ﷺ کے سر

اعلیٰ درجہ حاصل ہے تو استقامت حاصل ہے ورنہ نہیں (۱۰۶) باقی سب کو خارج کردیا (۱۰۷) کسیلا کسیلا

ہوگئے۔ کہ ہم کو کچھ مال دلوائیے۔ آپ ﷺ نے وعدہ فرمایا کہا نہیں ابھی دلوایئے اور یہ کہہ کر آپ ﷺ کی چادر زور سے کھینچ لی۔ جس سے گردن مبارک پر نشان ہوگیا۔ مگر آپ ﷺ نے کسی کو کچھ نہیں دھمکایا پس ہنس کر یہ فرمایا۔ ردائی ردائی۔

ارے بھائی میری چادر تو دے دو۔

ہماری مولانا فتح صاحب کے پاس ایک ولایتی طالب علم پڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی بات پر سبق میں آپ کو غصہ آگیا۔ تو مولانا سے کہتا ہے کہ تم کافر ہو۔ مولانا فرمایا کہ پھر کافر سے پڑھنے کیوں آئے۔ کہا کافر سے فن سیکھنا جائز ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں معافی چاہنے آیا اور کہا مولوی صاحب ہماری بات کا برا نہ ماننا۔ تم ہمارا معشوق ہے ہم تمہارا عاشق ہے اور عاشق معشوق کو کہہ ہی لیا کرتا ہے تو ایک محبت ولایتی بھی ہوتی ہے۔ جس میں گستاخی بھی جائز ہے۔

غرض جس طرح اس اعرابی نے رحمت کو تنگ کردیا تھا۔ اسی طرح جو لوگ استقامت میں غلو کرتے ہیں۔ وہ بھی رحمت کو تنگ کرتے ہیں ان کے نزدیک جنت بس انہی کے واسطے ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ استقامت کا ہر درجہ استقامت ہے۔ اور ہر درجہ کے لیے فضیلت ثابت ہے۔ پس استقامت کے سیدھے سادے معنی وہ ہیں۔ جو اس آیت کی تفسیر میں منقول[108] ہیں۔ آیت یہ ہے۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا ۔

اور تفسیر یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے یوں کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس پر جمے رہے (یعنی مرتد نہیں ہوئے) البتہ قالوا میں ایک قید بے شک ضروری ہے۔ یعنی قالوا بقلوبھم کہ انہوں نے حق تعالیٰ کی ربوبیت و توحید[109] کا

(۱۰۸) اس آیت کی تفسیر میں بیان کیے گئے ہیں (۱۰۹) رب ہونے اور ایک ہونے کا اقرار

اقرار دل سے کیا ہو۔ پس قواعد شرعیہ سے یہ قید ضروری ہے کیوں کہ بدون تصدیق بالقلب کے ایمان معتبر نہیں۔[۱۱۰] ۔ پھر حق تعالیٰ کے اعتبار سے تو قلب کا ایمان کافی ہے۔ مگر اجراء[۱۱۱] احکام کے لیے زبان سے کہنا بھی شرط ہے۔ جس میں حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کے ایمان کا علم ہو۔ تو وہ اس کو اپنا آدمی سمجھیں۔ اس کے حقوق ادا کریں اور کفار اس سے الگ رہیں۔ اس کو اپنے اندر ملانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ تو ظاہری قواعد سے حکمت معلوم ہوتی ہے۔ اور قواعد باطن سے اس میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے۔ کہ جیسے باطن کا اثر ظاہر پر ہوتا ہے۔ اسی طرح ظاہر کا بھی اثر باطن پر ہوتا ہے۔ چنانچہ بچوں کے حفظ قرآن کا طریقہ تکرار باللسان[۱۱۲] ہے۔ زبان سے جس لفظ کو بار بار کہا جاتا ہے وہ دل میں جم جاتا ہے۔ اسی طرح ذکر باللسان کو زیارت اثر فی الباطن[۱۱۳] میں دخل ہے۔

پس ان الذین قالوا ربنا اللہ کے معنیٰ یہ ہیں۔ الذین آمنوا بالقلب و صدقوا باللسان. جنہوں نے دل سے خدا کو مانا اور زبان سے تصدیق کی اور ثم استقاموا کے معنیٰ یہ ہیں کہ اقاموا علیہ ولم یرتدوا پھر اس پر جمے رہے اور مرتد نہیں ہوئے۔ جزو اول قالوا ربنا اللہ میں احداث ایمان[۱۱۴] ہے اور جزو دوم ثم استقاموا میں ابقاء ایمان[۱۱۵] ہے۔ یہ معنیٰ ہیں استقامت کے سیدھے سادے۔ آگے اس پر تفریع ہے۔

تتنزل علیھم الملئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا .[۱۱۶]

کہ ان پر فرشتے اترتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے آتے ہیں (کہ آخرت کے

---

(۱۱۰) کیونکہ بغیر دل سے یقین کیے ایمان معتبر نہیں
(۱۱۱) انسان پر مسلمان ہونے کا حکم اور اس کو احکام کا پابند اس وقت کیا جائے گا جب زبان سے اقرار کرے (۱۱۲) زبان سے بار بار رٹنا (۱۱۳) زبان سے ذکر اللہ کرنے کا انسان کے باطن پر خوب اثر ہوتا ہے (۱۱۴) ایمان کا وجود (۱۱۵) ایمان کا باقی رہنا (۱۱۶) حم سجدہ آیت ۳۰

احوال سے) ڈرومت اور (دنیا کے فوت ہونے کا) غم نہ کرو لئے یہ فضیلت ہر مومن کو جو مرتد نہیں ہوا حاصل ہوگی۔ کیونکہ استقامت کا ایک درجہ اس کو بھی حاصل ہے اور یہاں جس فضیلت کا ذکر ہے۔ وہ مطلق استقامت پر متفرع[۱۱۷] ہے۔ خواہ کسی درجہ کی استقامت ہو۔ مگر نہ معلوم ان واعظوں نے کہاں سے مخلوق کا گلا گھونٹ دیا اور استقامت کو اعلیٰ درجہ میں کس دلیل سے منحصر کردیا۔ پس یہ تنہا ہی جنت میں جانا چاہتے ہیں۔ اکیلے ہی قلانچیں[۱۱۸] مارتے پھریں گے۔ مگر جب یہ دوسروں کو محروم کرنا چاہتے ہیں۔ تو خود بھی نہ جائیں گے۔ کیونکہ جب لوگوں کو کمال تقویٰ سے قاصر ہونے کی وجہ سے یہ جنت سے محروم سمجھتے ہیں تو اس کے مواخذہ میں بھی اول مستحق کیسے ہوجاویں گے۔

استقامت آسان ہے

بعض لوگوں کو بعض نصوص[۱۱۹] سے اس کا شبہ ہوگیا ہے کہ استقامت دشوار چیز ہے۔ چنانچہ بعض نے فاستقم کما امرت[۱۲۰] سے کما امرت کی قید دیکھ کر یہ سمجھا ہے۔ کہ استقامت کوئی بڑی چیز ہے۔ جب ہی تو اس کو کما امرت کے ساتھ مقید کیا گیا۔ ورنہ اس قید کی کیا ضرورت تھی اور یہ حکم حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ آگے ومن تاب معک بھی ہے۔ جس سے مطلب یہ ہوا۔

استقم کما امرت ولیستقم من تاب معک کما امروا .

کہ جس طرح کا آپ کو امر ہے۔ اس طرح آپ مستقیم رہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں۔ جیسے ان کو امر ہوا ہے اس طرح وہ مستقیم رہیں۔ اس سے

---

(۱۱۷) وہ مطلق استقامت پر مل جاتی ہے (۱۱۸) قلا بازیاں کھاتے پھریں گے (۱۱۹) بعض آیات سے
(۱۲۰) سورہ ھود آیت ۱۱۲

معلوم ہوا کہ سب کو امر الٰہی کے موافق استقامت حاصل کرنے کا حکم ہے اس سے کم درجہ کافی نہیں۔

تو سمجھنا چاہیئے۔ کہ یہ لوگ قرآن کے سیاق و سباق[۱۲۱] میں غور نہیں کرتے اس لیے شبہ میں پڑگئے۔ اگر ماسبق و مالحق[۱۲۲] کو ملا کر اس آیت کو دیکھتے تو اشکال نہ ہوتا اصل بات یہ ہے کہ یہاں اس سے پہلے کفار کا ذکر ہے۔ چنانچہ اس آیت کے اوپر یہ آیت ہے۔

ولقد آتینا موسی الکتاب فاختلف فیہ ط ولولا کلمۃ سبقت من ربک لقضی بینھم ط وانھم لفی شک منہ مریب . وان کلا لما لیوفینھم ربک اعمالھم انہ بما یعملون خبیر[۱۲۳] .

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی۔ سو اس میں بھی اختلاف کیا گیا اور اگر ایک بات نہ ہوتی۔ جو آپ کے رب کی طرف سے ٹھہر چکی ہے۔ تو ان کا فیصلہ (ابھی) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ اس (فیصلہ) کی طرف سے ایسے شک میں ہیں۔ جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے اور بالیقین سب کے سب ایسی ہی ہیں۔ کہ آپ کا رب ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا حصہ دے گا۔ بالیقین وہ ان کے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔

فاستقم کما امرت و من تاب معک[۱۲۴]

جس سے ظاہر و متبادر یہ ہے۔ کہ اس آیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تسلیہ مقصود[۱۲۵] ہے۔ گو تسلیہ صریح[۱۲۶] نہ ہو مگر اس میں تسلیہ کا مضمون ضروری

---

(۱۲۱) قرآن کی آیت کے اول و آخر میں (۱۲۲) اگر اس سے پہلے اور بعد والی آیت کو ملا کر دیکھتے (۱۲۳) سورہ ھود آیت ۱۱۰ (۱۲۴) سورہ ھود آیت ۱۱۲ (۱۲۵) اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے (۱۲۶) واضح تسلی

ہے۔ کیونکہ ایسا مضمون تسلیہ صریحہ میں بھی مذکور ہے۔ حق تعالیٰ کی عادت ہے۔ کہ کفار کی حالت بیان فرما کر حضور ﷺ اور مسلمانوں کی تسلی اس طرح کرتے ہیں کہ سب کو اپنے اپنے کام میں لگنے کا حکم فرماتے ہیں۔ کہ تم اپنے کام میں لگے رہو۔ کفار کا معاملہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم نمٹ لیں گے۔ چنانچہ یہی مضمون یہاں بھی ہے۔ کہ اول کفار کا حال بیان فرمایا کہ یہ لوگ پہلے انبیاء سے بھی اختلاف کر چکے ہیں آپ کے ساتھ کفار کا اختلاف کوئی نئی بات نہیں اور ہم ان کو ابھی سزا دیتے۔ مگر ہماری طرف سے ایک بات ٹھہر چکی ہے۔ اس لیے دنیا میں فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ باقی وقت معلوم پر سب کو اپنے اپنے کیے کا بدلہ ملے گا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ **فاستقم کما امرت** .

یعنی جب ان کی سزا کا معاملہ آپ سے کچھ سروکار نہیں رکھتا۔ تو آپ اور مسلمان کفار کی فکر میں نہ پڑیں ۔ بلکہ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ کر آپ اور مسلمان اپنے کام میں لگے رہیں۔ جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو حکم ہے۔

یہ حاصل ہے آیت کا بھلا اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ استقامت کوئی ایسی دشوار چیز ہے۔ جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو خاص طور پر حکم دیا گیا ہے۔

بعض لوگوں کو حدیث استقیموا ولن تحصوا سے شبہ ہوا ہے۔ جس کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں مستقیم رہو مگر تم سے احصار[۱۲۷] نہ ہو سکے گا اور کہتے ہیں کہ دیکھو اس میں حضور ﷺ نے بتلادیا کہ استقامت پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کا احصار دشوار ہے مگر یہ مطلب بیان کرنے والا بعینہ اس کا مصداق ہے کہ :۔ **حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء**[۱۲۸] .

(۱۲۷) احاطہ (۱۲۸) ایک چیز کی حفاظت کی اور بہت سی باتوں سے غافل ہوئے

صاحب! اگر ولن تحصوا کا متعلق وہی استقامت ہے۔ جس کا امر کیا گیا ہے۔ تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ حضور ﷺ ایسے کام کا حکم فرماتے ہیں جو کبھی نہیں ہوسکتا یہ تو لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا[۱۲۹] کے صریح خلاف ہے کہ یہ بھی فرماتے ہیں ۔ کہ استقامت حاصل کرو اور یہ بھی فرمارہے ہیں کہ تم سے ہو نہ سکے گی۔ تو پھر جو کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا امر ہی[۱۳۰] کس واسطے کیا گیا۔ اس لیے یہ مطلب غلط ہے۔

میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ:۔

استقیموا مااستطعتم ولا تتمقوا فیھا فانکم لن تحصوھا ولا یشاد الدین احدا لا غلبه .

یعنی جتنی استقامت تم سے ہوسکے حاصل کرو یہ تو مامور بہ ہے۔ باقی اس میں تعمق و مبالغہ نہ کرو۔ کیونکہ یہ مامور بہ نہیں اور تعمق و مبالغہ سے جس اعلیٰ درجہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ تم سے نہ ہوسکے گا۔ اور یہ تو ان لوگوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ استقامت کے اعلیٰ درجہ کو مامور بہ کہتے ہیں۔

اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ وہ اعلیٰ درجہ میں جس میں تعمق و مبالغہ[۱۳۱] ہو مامور بہ نہیں ہے۔ باقی جو مطلب حدیث کا یہ لوگ سمجھے ہیں۔ وہ تو نص کے خلاف ہے۔ حق تعالیٰ نے وسعت سے زیادہ کہیں امر نہیں کیا اور ہر موقعہ پر جہاں اس قسم کا شبہ واقع ہوا۔ فوراً اشکال رفع کیا ہے۔ چنانچہ جب **اتقوا اللہ حق تقاته**[۱۳۲] .

(ترجمہ) اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تو صحابہؓ کو اشکال ہوا

---

(۱۲۹) اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ مشقت میں نہیں ڈالتے (۱۳۰) حکم (۱۳۱) جس میں گہرائی اور غلو ہو (۱۳۲) سورہ آل عمران آیت ۱۵۲

کہ یہ کس سے ہو سکے گا- اور ایسا تقویٰ جو حق الوہیت کے شایان ہو، کون کر سکتا ہے؟ تو اس پر فوراً یہ آیہ نازل ہوئی-

فاتقوا اللہ مااستطعتم واسمعوا واطیعوا[۱۳۳] .

یعنی اللہ سے اتنا ڈرو جتنا تم سے ہو سکے-

بعض صحابہؓ نے اس کو پہلی آیت کے لیے ناسخ فرمایا ہے- مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے تصریح کی ہے اور خوب ہی فرمایا ہے کہ نسخ اصطلاح سلف میں بیان تفسیر و بیان تبدیل دونوں کو عام ہے پس بعض صحابہؓ کا اس کو پہلی ہی آیت کے لیے ناسخ فرمانے کا مطلب یہ ہے- کہ اس سے پہلی آیت کی تفسیر ہو گئی اور بتلادیا گیا کہ حق تقاتہ سے مراد وہ تقویٰ ہے جو تمہاری استطاعت میں ہو- جتنا تقویٰ تم سے ہو سکے گا وہ حق تقاتہ ہی میں داخل ہے- بحمد اللہ اشکالات سب رفع ہو گئے اور معلوم ہو گیا- کہ یہاں جو فضائل اور بشارتیں استقامت پر متفرع ہیں[۱۳۴]- وہ ہر مسلمان کو حاصل ہوں گی- کیونکہ استقامت کا ایک درجہ ہر مومن کو حاصل ہے-

مگر اس پر اب شاید یہ اشکال ہو کہ اگر اس آیت میں استقامت کے یہی معنی ہیں کہ بس ایمان حاصل ہو اور ایمان کے بعد مرتد نہ ہو- تو آگے اس استقامت کے بہت سے فضائل مذکور ہیں- کہ ان اہل استقامت پر رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں- بشارت سناتے ہیں خوف و حزن[۱۳۵] کو رفع کرتے ہیں فرشتے ان کے رفیق ہوتے ہیں - اس میں صالح اور فاسق[۱۳۶] سب برابر ہو جائیں گے اور اگر فاسق کو بھی یہ فضائل حاصل ہو گئے تو اس کو اور کیا ضرورت رہی- بس ایک شخص آمنت باللہ نہ زبان سے اور دل سے کہہ لے اور اس پر جمارہے - پھر جو

(۱۳۳) التغابن آیت ۱۶ (۱۳۴) استقامت اختیار کرنے پر ملیں گے (۱۳۵) غم (۱۳۶) نیک اور گناہگار

چاہے اعمال کرتا رہے اس کے لیے رحمت بھی ہے بشارت بھی ہے- فرشتوں کی رفاقت بھی ہے- حزن و خوف سے بے فکری بھی ہے-

اس اشکال کا جواب میں ایک قاعدہ کلیہ[۱۳۷] سے دیتا ہوں- جو ہر مقام پر کار آمد ہے- کیونکہ یہ اشکال کچھ اسی آیت کے ساتھ خاص نہیں - بلکہ بعض احادیث پر بھی واقع ہوتا ہے- جیسے **من قال لا اله الاالله دخل الجنة .**

وہ قاعدہ کلیہ میں نے اپنے استاد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنا ہے- کتابیں زیادہ دیکھنے کی مجھے عادت نہیں- اگر کسی کو وسعت نظر کا شوق ہو- ان کو یہ شوق مبارک ہو- ہمیں تو حق تعالیٰ نے اساتذہ ہی ایسے دیے تھے- جنہوں نے بہت سی کتب سے مستغنی کر دیا- کیسا ہی اشکال ہو- ان کی چند باتوں سے جو یاد ہیں- رفع ہو جاتا ہے- مولانا فرماتے ہیں کہ "شارع[۱۳۸] نے جو اعمال کے فضائل بیان کیے ہیں وہ گویا خواص اعمال ہیں اور خواص اشیاء کا ظہور عقلاً ارتفاع موانع سے مشروط ہوتا ہے"[۱۳۹]

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب ادویات کی خاصیت بیان کرے- تو ہر عاقل اس کا یہ مطلب سمجھتا ہے- کہ اگر اس کے مخالف کوئی مضر[۱۴۰] چیز نہ کھائی جائے- تو یہ نفع ظاہر ہوگا- بس اگر کوئی خمیرہ گاؤزبان عنبری پر دو تولہ سنکھیا[۱۴۱] بھی کھالے اور مر جائے تو اس سے خمیرہ کے خواص غلط نہ ہو جائیں گے- اسی طرح لا الہ الا اللہ دل سے کہنے اور اس پر مستقیم رہنے کی بھی خاصیت

(۱۳۷) ایک اصولی قاعدے (۱۳۸) حق تعالیٰ
(۱۳۹) کسی چیز کی خاصیت اسوقت ظاہر ہوگی جب اس سے روکنے والی کوئی چیز نہ ہو (۱۴۰) نقصان دہ
(۱۴۱)

ہے۔ کہ اس سے ملائکہ رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ بشارت سنائی جاتی ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس کے منافی کوئی کام نہ کرے۔ مثلاً لاالہ الا کے بعد ان اللّٰہ ثالث ثلثة یا المسیح ابن اللّٰہ وغیرہ نہ کہے[۱۳۲] اگر کلمہ ایمان کے بعد کلمہ کفر بھی کہہ دے گا۔ تو اس کی وہی مثال ہوگی۔ جیسے خمیرہ کے بعد سنکھیا کھالے۔

پھر منافی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو پورا منافی ہو۔ جیسے کلمہ ایمان کا مقابلہ کلمہ کفر ہے۔ یہ تو مبطل خاصیت[۱۳۳] ہے کہ لا الہ الا اللّٰہ کی خاصیت کو بالکل باطل و زائل کردے گا۔ اور ایک وہ جو پورا منافی نہ ہو بلکہ فی الجملہ منافی ہو۔ جیسے کفر کے علاوہ اور معاصی ہیں[۱۳۴] ان سے کلمہ ایمان کی خاصیت باطل تو نہیں ہوتی۔ مگر کمزور ہوجاتی ہے۔ نفع دیر میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے خمیرہ گاؤزبان کے ساتھ کھٹائی اور تیل اور گڑ اور سرکہ اور بینگن بھی کھائے جائیں کہ ان اشیاء سے خمیرہ کی قوت کمزور ہوجائے گی اور نفع دیر میں ظاہر ہوگا۔

اس تقریر سے ایک اور شبہ کا جواب معلوم ہوگیا اور یہ کہ میں نے جو اوپر کہا تھا کہ یہ فضائل خواص اعمال[۱۳۵] ہیں اور خواص کا ظہور رفع موانع[۱۳۶] کے ساتھ مشروط ہوتا ہے اس پر کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے تو رسول اللہ ﷺ کے سامنے موانع اور مضرات کو بھی پیش کیا تھا۔ کہ :۔ یا رسول اللّٰہ و ان زنی و ان سرق ۔

مگر حضور ﷺ نے ان کو مضر نہیں مانا۔ یعنی جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی لاالہ الا اللہ کا معتقد ہو کر مرجائے وھو لا یشرک باللّٰہ اس حال میں کہ وہ شرک نہ کرتا ہو۔ تو یہ شخص جنت میں جائے گا۔ اس پر حضرت ابوذرؓ نے

---

(۱۳۲) تین میں سے تیسرا اللہ ہے یا حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں (۱۳۳) اس کی خاصیت کو ختم کردینے والا (۱۳۴) گناہ (۱۳۵) اعمال کا خاصہ (۱۳۶) اس خاصہ کو روکنے والی چیز کو ہٹا دیا جائے

عرض کیا کہ یا رسول اللہ ! چاہے اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا:- **و ان زنی و ان سرق .**

ہاں اگرچہ اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان خواص کا ظہور بد پرہیزی سے بچنے کے ساتھ مقید نہیں۔

تقریر گذشتہ سے یہ اشکال اس طرح حل ہوا۔ کہ اس حدیث میں حضور ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے۔ کہ زنا و سرقہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے لیے مبطل نہیں[۱۴۷]۔ حضرت ابوذرؓ اس کو مبطل سمجھتے تھے حضور ﷺ نے اس کی نفی کردی۔

رہا یہ کہ اعمال کسی درجہ میں بھی لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے منافی اور مضر نہیں۔ یہ اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسرے نصوص سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زنا و سرقہ وغیرہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے لیے مضعف[۱۴۸] اور اس کے ظہور کے لیے مؤخر نہیں[۱۴۹]۔ یعنی ایسا شخص جنت میں تو ایمان کی برکت سے چلا جاوے گا۔ مگر دیر میں جائے گا یا یہ کہا جائے کہ ایمان کی خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے۔ مگر مفرد جب دوسرے اجزاء سے مرکب ہوجاتا ہے۔ تو مرکب کا مزاج دوسرا ہوجاتا ہے۔ پس اگر ایمان اعمال صالحہ کے ساتھ مرکب ہوا تو اس وقت مجموعہ کا مزاج اور ہوگا۔ اس وقت ایمان کی خاصیت تیز اور قوی ہوگی۔ کیونکہ یہ اجزاء لا الہ الا اللہ کے مناسب ہیں اور اگر اعمال سیہ سے مرکب ہوا[۱۵۰]۔ تو مجموعہ کا مزاج دوسرا ہوگا۔ یا یہ کہا جائے کہ خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے۔ مگر عارض و موانع کی وجہ سے دیر ہوجائے گی۔ پس اب یہ دعویٰ محقق ہوگیا کہ یہاں

---

(۱۴۷) خاصیت کو ختم کرنے والا نہیں (۱۴۸) کمزور کرنے والے (۱۴۹) خاصیت کے اظہار میں تاخیر کا باعث (۱۵۰) برے اعمال سے مرکب ہوا

جس فضیلت استقامت کا ذکر ہے۔ وہ مطلق استقامت علی الایمان ہی کی فضیلت ہے۔ خواہ کسی درجہ کی ہو۔

فضائل استقامت

اب ان فضائل کو سنیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ تتنزل علیھم الملئکۃ[۱۵۱] کہ ان پر رحمت و بشارت کے فرشتے اتریں گے۔ در منثور میں[۱۵۲] زید بن اسلم سے مروی ہے کہ نزول ملائکہ تین وقتوں میں ہوگا۔ اول تو مرتے ہوئے بشارت دیں گے۔ چنانچہ حدیث مرفوع میں بھی ہے۔ کہ مومن جب مرتا ہے۔ تو رحمت کے فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں:۔ اخرجی ایتھا النفس المطمئنۃ الی روح و ریحان ورب غیر غضبان ۔

ترجمہ:۔ اے نفس مطمئنہ نکل طرف راحت اور بہار کے اور طرف ایسے پروردگار کے جو ناراض و غضب ناک نہیں ہے۔ اس وقت مسلمان لقاء اللہ کا مشتاق ہوجاتا ہے[۱۵۳]۔

اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ مسلمانوں کو تو مرتے ہوئے بہت کرب[۱۵۴] ہوتا ہے۔ یہ تو خوشی کے ساتھ جانے کی علامت نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے ایک جسم، ایک روح ۔ تو کرب نزع[۱۵۵] میں مومن کے جسم کو تو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر روح کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ جس کی ہم کو خبر نہیں ہوتی۔ کیونکہ روح مبصر[۱۵۶] نہیں اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی معشوق عاشق کو بغل میں لے کر ایسا زور سے دبائے کہ اس کی آنکھیں نکل آئیں تو

---

(۱۵۱) حٰم سجدہ آیت ۳۵ (۱۵۲) کتاب کا نام ہے (۱۵۳) اللہ سے ملاقات کا شوق مسلمان کو ہوجاتا ہے (۱۵۴) بہت تکلیف ہوتی ہے (۱۵۵) نزع کی تکلیف کے وقت (۱۵۶) روح دکھائی نہیں دیتی

اس کے جسم کو تو کلفت ہے۔ مگر دل سے وہ اس حال میں شاداں وفرحاں [۱۵۷] ہوتا ہے اور ایسا خوش ہوتا ہے۔ کہ اگر محبوب یہ کہے کہ تم کو کلفت ہوتی ہے تو لاؤ تم کو چھوڑ کر رقیب کو دبانے لگوں۔ تو وہ یہ کہے گا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی [۱۵۸]

اور یوں کہے گا۔

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

پس شدت نزع اس شخص کے عاصی [۱۵۹] کی علامت نہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ کہ جب سے میں نے حضور ﷺ کی شدت نزع [۱۶۰] دیکھی ہے۔ اس وقت سے سہولت نزع کی تمنا نہیں رہی۔ کیونکہ پہلے تو یہ خیال تھا۔ کہ سہولت نزع کوئی اچھی اور مطلوب شئے ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ شدت بھی مذموم [۱۶۱] نہیں ورنہ حضور ﷺ کو کیوں ہوتی؟۔

دراصل شدت نزع کا مدار طاعت و معصیت پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے سبب دو ہیں۔ ایک قوت جسم، دوسرے کثرت تعلقات۔ کیونکہ موت کے وقت روح طبی جسم سے جدا ہوتی ہے۔ اگر جسم قوی ہے تو روح کا طبی انفصال اس سے دقت کے ساتھ [۱۶۲] ہوگا۔ کیونکہ وہ رگ رگ میں پیوستہ ہوتی ہے اور چونکہ روح مجرد کو بھی روح طبی کے واسطہ سے جسم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ تو اگر روح مجرد

---

(۱۵۷) خوش و مسرور (۱۵۸) دشمن کا ایسا مقدر نہ ہو کہ تو اس پر اپنی تلوار آزمائے دوستوں کا سر سلامت ہے تو اس پر اپنے خنجر کو آزمالے (۱۵۹) گناہ گار (۱۶۰) روح نکلنے کے وقت کی سختی (۱۶۱) سختی بھی ناپسندیدہ نہیں (۱۶۲) روح مشکل سے نکلے گی

کو دنیا کی چیزوں کے ساتھ تعلق زیادہ ہوگا - تو اس تعلق کا منقطع ہونا اسے ناگوار (۱۶۳) ہوگا۔ اس لیے وہ جسم سے اپنا تعلق دیر میں قطع (۱۶۴) کرتی ہے۔ اس کے بعد سمجھیے کہ رسول اللہ ﷺ کا جسم بھی قوی تھا اور آپ ﷺ کی روح اقدس کو اپنی امت کے ساتھ تعلق بھی بہت تھا۔ وصال کے وقت آپ کو اپنی امت کی طرف سے فکر تھی۔ اس لیے شدت ہوئی۔ جب حق تعالیٰ نے آپ کو امت کی طرف سے بے فکر کردیا۔ اس وقت روح نے جسم سے تعلق منقطع کیا۔ اب اگر یہ تعلق محمود ہے تو شدت نزع محمود ہے (۱۶۵) جیسا کہ حضور ﷺ کے واقعہ میں ہوا اور اگر تعلق مذموم ہے تو شدت مذموم ہے (۱۶۶) اور اگر کسی کی روح کو اشیاء دنیا سے کچھ بھی تعلق نہ ہو تو نزع میں سہولت ہوگی۔ چاہے میت کافر ہی ہو۔ جیسے کوئی جوگی تعلقات واجبہ و غیر واجبہ سب کو قطع کردے (۱۶۷) تو اس کو نزع میں سہولت ہوگی۔ گو یہ سہولت محمود نہیں (۱۶۸)۔

اسی طرح اگر کسی کا جسم بہت کمزور ہو اس کو بھی نزع میں آسانی ہوگی اور یہ بھی کچھ کمال نہیں۔ چنانچہ مدقوق (۱۶۹) کا جسم بہت کمزور ہوجاتا ہے اس کو نزع سہل ہوتا ہے۔ کہ پاس والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ کہ روح کب نکل گئی چاہیے مدقوق مومن ہو یا کافر۔ بہر حال شدت نزع کو بشارت ملائکہ سے کچھ منافات نہیں۔ ہر مومن مرتے ہوئے فرشتوں کی بشارتیں سن کر خدا سے ملنے کا مشتاق ہوجاتا ہے۔ گو جسم سے جان نکلنے میں کلفت ہی کیوں نہ ہو۔

اس وقت اس کی وہ حالت ہوگی جیسے کسی شخص کو اس کا محبوب کھڑکی میں

---

(۱۶۳) اس تعلق کا ٹوٹنا اسے ناپسندیدہ ہوگا
(۱۶۴) توڑتی ہے (۱۶۵) اگر یہ تعلق پسندیدہ ہے تو موت کی سختی بھی پسندیدہ ہے (۱۶۶) اگر تعلق ناپسندیدہ ہے موت کی سختی بھی ناپسندیدہ ہے (۱۶۷) ایسے تعلقات جو اس کے ذمہ واجب ہیں اور جو واجب نہیں سب ختم کردے (۱۶۸) یہ سہولت پسندیدہ نہیں (۱۶۹) جس کو دق کا مرض لاحق ہو

نکلنے کو کہے کہ اس ایک تنگ کھڑکی میں سے نکل کر ہمارے پاس آؤ- تو اس وقت وہ بستر سے بدل کر اور دب بچک کر جانے کی کوشش کرے گا- گو اس حالت میں اس کے جسم پر خراش آجائے گا- مگر اندر سے اس کا دل وصال محبوب کا خیال کرکے خوش ہوگا- بلکہ اس تکلیف پر بھی وہ خوش ہوگا- کیونکہ محبوب اس کے سامنے ہے- وہ جانتا ہے- کہ محبوب میری اس مشقت کو دیکھ رہا ہے- کہ میں کس مصیبت سے اس کے پاس جانے کی کوشش کر رہا ہوں- اس وقت وہ زبان حال سے یوں کہتا ہوا جائے گا-

بجرم عشق توام میکشند وغوغائیست

تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست[170]

واقعی محبوب کے حکم کی تکمیل میں یا اس کی محبت میں نگاہوں کے سامنے جتنی بھی تکلیف ہو سب آسان ہوجاتی ہے-

اسی لیے حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو یہ مراقبہ تعلیم فرمایا ہے:- واصبر لحکم ربک فانک باعیننا[171].

اپنے رب کے حکم کے لیے (تکالیف پر) صبر کیجیے کیونکہ آپ ہمارے سامنے ہیں ہم آپ کی سب حالت دیکھ رہے ہیں یہاں بیان فانک باعیننا بڑھا کر صبر کو آسان کردیا-

ایک عاشق کو کسی شخص کے ساتھ محبت کے جرم میں لوگوں نے بہت مارا - ننانویں کوڑوں پر تو اس نے ایک بھی آہ نہ کی- سویں کوڑے پر اس کے منہ سے آہ نکلی بعد میں کسی نے پوچھا کہ تو نے ننانوے کوڑوں میں تو آہ نہ کی- اخیر

(۱۷۰) تیرے عشق کی پاداش میں مجھے سزا دیے جانے کا شور ہے تو بھی دروازے میں آکر دیکھ کہ خوب تماشہ ہو رہا ہے (۱۷۱) سورہ طور آیت ۴۹

کے کوڑے پر آہ کی۔ اس کی کیا وجہ تھی۔ کہ ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا۔ میرا حال دیکھ رہا تھا۔ اس لیے مجھ کو کلفت کا احساس نہ ہوا بلکہ اس میں مزہ آرہا تھا۔ کہ محبوب دیکھ رہا ہے۔ کہ اس کی محبت میں میرا کیا حال ہے۔ اخیر کوڑے پر وہ چلا گیا۔ اس لیے کلفت[۱۷۲] کا احساس ہوا۔

صاحبو! یہ تو اس کا محبوب تھا۔ جس کی نگاہ سے عاشق غائب ہو گیا اور ہمارا محبوب ایسا ہے کہ کسی وقت کوئی چیز اس سے غائب نہیں ہے۔ ہمارے ہر حال کو دیکھ رہا ہے۔ پھر فانک باعیننا جس کے پیش نظر ہو۔ اس کو مصائب میں کیوں کلفت ہو۔ بہر حال شدت نزع کا شبہ رفع ہو گیا غرض ایک تو یہ وقت ہے نزول ملائکہ کا جب کہ مومن مرتا ہے اور روح نکلنے کے بعد کی کیفیت حدیث میں آتی ہے۔

حتی انه لیناوله بعضهم بعضا .

یعنی فرشتے اس روح کو ایک دوسرے کو دیتے ہوئے لے چلتے ہیں۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ میں لیکر جاؤں۔ دوسرا چاہتا ہے۔ کہ میں لیکر جاؤں۔

دوسرا وقت اس کا قبر میں ہوتا ہے کہ فرشتے آتے ہیں اور مردہ سے سوالات کرتے ہیں۔

من ربک مادینک و من هذا الرجل .

تیرا پروردگار کون ہے تیرا دین کیا ہے اور یہ شخص کون ہیں۔ (یعنی رسول اللہ ﷺ) مومن تو جواب ٹھیک ہی دے گا[۱۷۳]۔ پھر اس کو فرشتے بشارت دیں گے۔

---

(۱۷۲) مشقت (۱۷۳) یہ جواب دے گا اللہ تیرا رب ہے اسلام میرا دین ہے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں

نم کنومة العروس[۱۷۴]۔

تیسرا وقت حشر کا ہے کہ اس وقت فرشتے آئیں گے اور قبر سے مومن کا استقبال کریں گے اور اس کو بشارتیں سنائیں گے اور تعظیم و تکریم کے ساتھ میدان حشر میں لے جائیں گے۔

شاید کسی کو یہاں یہ شبہ ہو کہ پھر اس بشارت کے بعد میدان حشر میں مسلمانوں کو پریشانی اور خوف کیوں ہوگا۔ جیسا کہ ظاہر احادیث سے معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ احادیث عام نہیں خود حدیث میں آتا ہے کہ مومن کو قیامت کا دن نماز کے وقت کے برابر معلوم ہوگا اسی کے مناسب میں نے مولانا فضل الرحمن صاحب سے سنا ہے فرماتے تھے۔

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست

عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست[۱۷۵]۔

عشاق کو تو قیامت کا پچاس ہزار برس کا دن اتنا معلوم ہوگا۔ جتنی نماز میں دیر لگتی ہے اور نماز بھی جلدی کی۔ جیسا کہ ہم پڑھا کرتے ہیں اور اگر حضرت ابو بکر صدیقؓ ہی جیسی نماز ہوئی۔ تو خیر ذرا کچھ زیادہ وقت لگ جائے گا۔ اگر یہ کہو کہ ہم کو تو شبہ ہوگیا۔ اگر حضرت ابوبکرؓ کی نماز کے برابر دیر لگی۔ تو وہ تو بڑی لمبی لمبی نماز پڑھتے تھے تو ارے بھائی ان کے دل سے پوچھو۔ کہ ان کو وہ گھڑیاں کیسی قلیل معلوم ہوتی تھیں۔ اسی طرح موقف کا وقت بھی قصیر ہی معلوم ہوگا[۱۷۶]۔

حضرت اویس قرنیؒ کی حالت یہ تھی کہ جب رات آتی تو فرماتے۔

---

(۱۷۴) نئی نویلی دلہن کیطرح سو جا (۱۷۵) عاشقوں کو قیامت کے دن روز محشر سے کوئی سروکار نہیں عاشقوں کے لیے تو وہ اللہ کے جلال کا جلوہ کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا (۱۷۶) میدان حشر میں کھڑے ہونے کا وقت بھی کم ہی لگے گا

هذه ليلة القيام.

یہ کھڑے ہونے کی رات ہے پھر رات بھر نماز میں کھڑے رہتے صبح کے قریب رکوع وسجدہ کر کے نماز پوری کر لیتے اگلا دن ہوتا۔ تو فرماتے۔ هذه ليلة الركوع.

یہ رکوع کی رات ہے۔ پھر رات بھر رکوع ہی میں رہتے کسی دن کہتے: هذه ليلة السجود.

یہ سجدہ کی رات ہے اور پھر رات بھر سجدہ میں رہتے اور صبح کے قریب فرماتے۔ کہ رات بہت جلدی گزر گئی ارمان پورا نہ ہوا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بھی وہ دیر کچھ دیر نہ معلوم ہوتی تھی۔ تو بھائی تم نے نماز تو لی ہے حضرت صدیقؓ کی اور وجدان لیا اپنا۔ یہ غلطی ہے۔ اگر ان جیسی نماز کے برابر بھی دیر ہوئی۔ تو وہ بھی تم کو کچھ دیر نہ معلوم ہوگی۔ بہر حال خواہ تمہاری نماز کے برابر دیر ہو یا اہل خشوع کی نماز کے برابر مومن بہت جلد چھوٹ جائے گا۔ اس کو زیادہ طول محسوس نہ ہوگا۔ خصوصاً اگر کوئی ایسا عاشق ہوا۔ جس کا کچھ سلسلہ بھی نہ ہو۔ وہ تو وہاں بہت ہی بے فکر ہوگا۔ جیسے احمد جام فرماتے ہیں۔ يغبطهم الانبياء والمرسلين[۱۷۷].

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار
دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد[۱۷۸]

---

(۱۷۷) انبیاء ومرسلین بھی ان پر رشک کریں گے

(۱۷۸) احمد تو عاشق ہے شیخت سے مجھے کیا سروکار دیوانگی اختیار کر تیرا سلسلہ چلے چلے نہ چلے نہ چلے

اکرام اہل استقامت

یہ عشاق قیامت میں نور کے ممبروں پر بیٹھے ہوں گے۔ ان کو کچھ فکر نہ ہوگا۔ حدیث میں ہے۔

کہ ان کی اس حالت پر انبیاءؑ بھی غبطہ[۱۷۹] کریں گے۔ کیونکہ انبیاءؑ کی پیشی ہوگی۔ ان سے سوال و جواب ہوگا۔ مگر یہ سب امت ہی کے متعلق ہوگا۔ خود ان کی ذات کے متعلق حساب و کتاب ان سے کچھ نہ ہوگا۔ اور اپنی ذات کے لیے انبیاء کو کچھ تشویش نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ تو معصوم ہیں۔ ہاں انبیاء کو امت کی فکر ہوگی اس لیے ان بے فکروں پر غبطہ کریں گے۔ کہ یہ بڑی چین میں ہیں ان کو کسی کی بھی فکر نہیں۔

مگر اس سے ان اولیاء کی فضیلت انبیاء پر لازم نہیں آتی کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے حاکم ضلع جس وقت اپنے ماتحت حکام کے عملہ والوں کو اپنے اپنے کام کی اور حاکم کو اپنے عملہ کی کہ کہیں ان پر کوئی جرم قائم نہ ہو جائے اس وقت حاکم کے اردلی اور سائیس کو کچھ فکر نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے سپرد عملہ کا کام ہی کچھ نہیں اس وقت حاکم عملہ کو اپنے اردلی کی بے فکری پر رشک ہو سکتا ہے۔ کہ یہ بہت بے فکر ہے مگر معائنہ کے بعد حاکم حاکم ہے اور اردلی اردلی ہے اسی طرح بعد فیصلہ کے انبیاء جب جنت میں جائیں گے تو ان کے مراتب سب سے اعلیٰ ہوں گے۔ اس وقت یہ اولیاء ان پر رشک کریں گے۔ غرض حشر میں بھی نزول ملائکہ ہوگا اور ان کی بشارت سے خوف و حزن کچھ نہ ہوگا۔

---

(۱۷۹) ان پر رشک کریں گے

اور تتنزل کا صیغہ بتلارہا ہے کہ یہ نزول بتدریج یکے بعد دیگرے ہوگا[۱۸۰] - تاکہ زیارت مسرت و انشراح اور زیادت اکرام کا سبب ہو[۱۸۱] جیسے ایک شخص مہمان ہوکر بادشاہ کے یہاں جائے تو اول تو اسٹیشن پر اس کا استقبال کرنے ایک جماعت آئے اور بشارت دے کہ بادشاہ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر چل کر ایک اور جماعت آئے اور خوشخبری و مبارک باد سنائے کچھ دیر کے بعد تیسری جماعت آئے اور وہ بھی مبارک باد اور خوشخبری سنائے۔ تو اس میں زیادہ مسرت و اکرام ہے۔ دفعۃً ہجوم سے تو مہمان بعض دفعہ گھبرا جاتا ہے۔ اس لیے وہاں ملائکہ کا نزول تدریجاً یکے بعد دیگرے ہوگا۔ پھر وہ سب کے سب یہ بشارت دیں گے۔ **لاتخافوا ولاتحزنوا** .

کہ آفات قیامت سے تم یہ اندیشہ نہ کرو اور دنیا کے چھوٹنے کا رنج نہ کرو۔ کیونکہ آگے تمہارے لیے امن وراحت اور نعم البدل ہے[۱۸۲]۔

وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون[۱۸۳] .

تم جنت کے ملنے پر خوش رہو۔ جس کا (پیغمبر کی معرفت) تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا اور دنیا کو جنت سے کچھ بھی نسبت نہیں۔ تو اب دنیا کے چھوٹنے کا کیا رنج۔

حقیقت دنیا

یہ تو ایسا ہوا جیسا کسی کو اشرفی[۱۸۴] مل جائے اور پیسہ بلکہ کوڑی[۱۸۵] کھو جائے تو اس سے کچھ بھی رنج نہ ہوگا بلکہ تمنا کرے گا کہ ایسا پیسہ تو ہر روز کھو

---

(۱۸۰) آہستہ آہستہ ایک دوسرے پر ہوگا (۱۸۱) تاکہ زیادہ خوشی اور زیادہ اکرام کا باعث ہو (۱۸۲) اچھا بدلہ (۱۸۳) حم سجدہ آیت ۳۵ (۱۸۴) اشرفی سونے کی ہوتی ہے (۱۸۵) ایک پیسہ سے بھی کم سکہ ہوتا تھا

جایا کرے۔ جس کے بدلہ میں اشرفی مل جائے یہی تو وجہ ہے۔ کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں۔

الدنیا ملعونۃ و مافیها ملعون الا ذکراللہ وما والاہ او عالم او متعلم[۱۸۶]۔

کیونکہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے پاخانہ۔ چنانچہ خواب میں اکثر دنیا کی یہی صورت دیکھی جاتی ہے۔ کانپور میں ایک طالب علم صاحب تھے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا۔ کہ حق تعالیٰ شانہ عرش پر جلوہ افروز ہیں اور سب آدمیوں کا امتحان لے رہے ہیں۔ ایک شخص پر سخت عتاب ہوا۔ یہ خواب دیکھنے والے کانپ اٹھے۔ وہاں عرش کے ایک گوشہ پر حضور ﷺ بھی رونق افروز ہیں۔ یہ عتاب کی حالت دیکھ کر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کرنے لگے۔ کہ یارسول اللہ! آپ کچھ مدد فرمایئے تو آپ نے فرمایا تم امتحان کے وقت یوں کہہ دینا۔ کہ میں تو کچھ علم نہیں رکھتا۔ اسی اثناء میں ان کو بھی امتحان کے لیے پکارا گیا اور فرمایا۔ کو لاؤ جلالین[۱۸۷] اس نے عرض کیا۔ کہ یا اللہ میں تو جاہل ہوں میں تو "جلالین" پڑھا ہوا بھی نہیں۔ اس پر تبسم فرمایا اور حکم ہوا۔ اچھا تمہارے ایک دن کی قید ہے۔ اس حکم کے بعد اس کو ایک کوٹھڑی میں لے گئے جو پاخانہ سے بھری ہوئی تھی اور وہاں قید کر دیا۔ اس خواب کی تعبیر بھی سمجھی گئی وہ کوٹھڑی دنیا کی صورت مثالی ہے۔ ان کو دکھلا دیا گیا کہ جس دنیا میں تم منہمک ہو وہ یہ ہے۔ پھر وہ دیکھا کہ اس کوٹھڑی سے نجات ہوئی اور اس کو ایک نہر میں غسل دیا گیا اور پاک صرف کر دیا گیا۔ اس کی تعبیر نہر الحیات سمجھی گئی۔

---

(۱۸۶) دنیا ملعون ہے اور جو اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے سوائے اللہ کے ذکر کے اور اس کے جو اس تک پہنچائے یا عالم ہو یا متعلم (۱۸۷) تفسیر کی ایک کتاب کا نام

اسی طرح ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ روز بستره پر پیشاب کر لیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی نے کہا کہ کم بخت تو جوان ہو کر بستره پر پیشاب کرتا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی کہا کیا بتلاؤں۔ خواب میں ہر روز شیطان آتا ہے کہ آؤ تم کو سیر کرالاؤں۔ میں اس کے ساتھ چل کھڑا ہوتا ہوں چلتے چلتے پیشاب لگ جاتا ہے۔ اس وقت میرے سامنے ایک پاخانہ نظر آتا ہے میں اپنے نزدیک تو اس کے قدمچہ[۱۸۸] پر بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں مگر وہ صبح کو بستر ملتا ہے۔ پیشاب کرتا کہیں ہوں اور نکلتا ہوں کہیں ہے۔ وہی مثال ہو گئی۔

جو تھے مژگان پر خون سب وہ خار دلنشیں نکلے
جنوں یہ کیسے نیشتر کہیں ڈوبے کہیں نکلے

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہ نے اس شعر کو ایک عجیب موقعہ پر لکھا ہے۔ بعض فرق باطلہ کا مذہب ہے۔ کہ استدبار بالمراۃ سے[۱۸۹] بھی حمل قرار پاجاتا ہے۔ مولانا نے اس پر لکھا ہے۔ کہ واقعی کیوں نہ اس کی وہی مثال ہے۔

جو تھے مژگان پر خوں سب وہ خار دلنشیں نکلے
جنوں یہ کیسے نیشتر کہیں ڈوبے کہیں نکلے

یہ تو بیچ میں ایک لطیفہ تھا۔ تو اس شخص کی بیوی نے کہا کہ اب کے شیطان خواب میں آئے تو اس سے کہنا کہ یار تم ہمارے دوست ہو گئے ہو کچھ ہمارے ساتھ ہمدردی کرو۔ کہ ہم تنگدست غریب آدمی ہیں۔ کہیں سے بہت سا مال ہم کو دلوادو۔

مرد نے کہا ضرور آج رات کو کہوں گا۔ رات ہوئی اور خواب میں جب

---

(۱۸۸) مثل فلش کے رفع حاجت کی جگہ (۱۸۹) عورت سے دبر میں وطی کرنے سے

معمول شیطان آیا اور اس نے بیوی کا پیغام اس سے بیان کیا شیطان نے کہا۔ کہ مال تمہارے واسطے بہت اور جتنا چاہو لے لو شیطان ایک خزانہ پر اسے لے گیا اور بہت سا مال اس کی کمر پر لادا اور اتنا لاد کر اس کے زور سے پاخانہ نکل گیا۔ اب جو صبح کو اٹھے ہیں تو مال تو غائب مگر بستر پر پیشاب کے ساتھ پاخانہ بھی موجود۔

بیوی نے کہا یہ کیا۔ اس نے سارا قصہ بیان کیا۔ بیوی نے کہا بس جی میں مال سے باز آئی تم پیشاب ہی کر لیا کرو۔ یہ پاخانہ کی مصیبت کون جھیلے تو یہ حقیقت ہے دنیا کی۔ کہ پاخانہ یعنی وبال(۱۹۰) تو رہ جائے گا اور حظوظ غائب(۱۹۱) جب دنیا کی یہ حقیقت ہے۔ تو پھر جنت میں پہنچ کر اس کے چھوٹنے کا کیا رنج۔ وہاں تو کسی قسم کی بھی کلفت نہ ہوگی۔ راحت ہی راحت ہے۔ اس کے بعد فرشتے کہیں گے۔ نحن اولیاء کم فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ (۱۹۲)۔

کہ ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رفیق رہیں گے۔ یہاں بھی تمہارا ساتھ ہر قدم پر دیں گے۔ دنیا میں فرشتوں کی رفاقت دو طرح ہوتی ہے۔ ایک تو وہ اعمال صالحہ انسان کے دل میں القا کرتے ہیں دوسرے مصائب کے وقت سکینہ واطمینان نازل کرتے ہیں۔ چنانچہ صبر کے وقت کلفت ضبط(۱۹۳) کے علاوہ قلب میں ایک قوت اور چین بھی ہوتی ہے۔ یہ اسی سکینہ کا اثر ہے۔ جہاد میں بھی ملائکہ سکینہ نازل کرتے ہیں۔ چنانچہ نص(۱۹۴) میں ہے۔ کہ بدر میں ملائکہ نازل ہوئے۔ اور ان کا کام یہ تھا فثبتوا الذین آمنوا(۱۹۵) کہ مسلمانوں کے قلوب کو قوت دیں اور لڑائی میں ان کو ثابت قدم بنائیں۔ گو قتال بھی ملائکہ سے ثابت ہے مگر اصل کام ان کا وہی تثبیت اور انزال

---

(۱۹۰) مصیبت (۱۹۱) لذتیں غائب (۱۹۲) حم سجدہ آیت ۳۱ (۱۹۳) ضبط کی مصیبت کے علاوہ (۱۹۴) قرآن میں ہے (۱۹۵) سورۃ الانفال آیت ۱۲

سکینہ تھا۔ تیسری رفاقت یہ ہے۔ کہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ نص میں ہے:۔

له معقبات من بين يديه و من خلفه يحفظونه من امر الله . واذا اراد الله بقوم سوٓ . فلا مرد له[۱۹۶]

انسان کے دشمن سانپ بچھو تو ہیں ہی اس کے دشمن جناب بھی ہیں اور فرشتے جناب سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ حفاظت نہ ہو تو جناب اس کی بوٹی بوٹی الگ کر دیں۔ ہاں جب حق تعالیٰ ہی کوئی مصیبت بھیجنا چاہیں۔ تب وہ نہیں ٹل سکتی اس وقت اس حفاظت کی صورت بدل دی جاتی ہے اور جناب یا حیوانات سے اس کو تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ اور آخرت کی ایک رفاقت تو اوپر معلوم ہو چکی۔ کہ مرتے ہوئے اور قبر میں اور حشر میں گھر سے نکلتے ہوئے بشارتیں سنائیں گے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور موقعہ پر بھی فرشتے حاضر ہوں گے یعنی جنت میں۔ یدخلون علیھم من کل باب[۱۹۷]۔ ہر دروازہ سے مسلمانوں کے پاس سلام کرنے اور مبارک باد دینے آئیں گے۔

سلام عليكم بما صبرتم فنعم عقبى الدار[۱۹۸]

آگے ارشاد ہے:۔

ولكم فيها ما تشتهى انفسكم ولكم فيها ما تدعون[۱۹۹]

یعنی جنت کو عیش محدود نہ سمجھنا۔ اس کی یہ حالت ہو گی۔ کہ جس چیز کو بھی تمہارا جی چاہے گا اس میں موجود ہے اور جو مانگو تمہارے لیے وہاں موجود ہے۔

---

(۱۹۶) سورہ رعد آیت ۱۱ (۱۹۷) سورہ رعد آیت ۲۳ (۱۹۸) سورہ رعد آیت ۲۴ (۱۹۹) حٰم سجدہ آیت ۳۱

اس پر ایک طالب علمانہ شبہ یہ ہو سکتا ہے۔ کہ لکم فیہا ما تشتھی انفسکم کے بعد لکم فیہا ما تدعون - کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ مانگنا تو چاہنے کی فرع[۲۰۰] ہے۔ جب وہاں ہر مشتہی[۲۰۱] موجود ہے۔ تو اس سے ہر مدعی کا ہونا خود لازم آ گیا۔ پھر اگر کسی وجہ سے اس کو بیان کیا گیا تھا۔ تو باقاعدہ بلاغت ابلغ کو موخر کرنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ترقی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہوا کرتی ہے نہ کہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف اور یہاں اعلیٰ کو مقدم کیا گیا ہے یعنی **ما تشتھی انفسکم** کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشتہی اور مدعی میں تو یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ منہ سے مانگی اور دل کی چاہی مرادیں وہاں سب برابر ہیں جیسے منہ مانگی مراد فوراً پوری ہوگی ایسے ہی دل کی چاہی مراد بھی فوراً پوری ہوگی۔ روایات میں ہے کہ جنتی کا دل کسی پھل کو دیکھ کر رغبت کرے گا۔ تو فوراً وہ پھل ٹوٹ کر سامنے آ جائے گا۔ اور اس کی جگہ فوراً ہی دوسرا پھل درخت پر پیدا ہو جائے گا۔ اس تسویہ[۲۰۲] کو بیان کرنے کے لیے دونوں کا ذکر ضروری تھا اور **لکم فیہا ما تشتھی انفسکم** کی تقویم[۲۰۳] ہے۔ مثلاً کہا کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں اشرفی اور پیسہ برابر ہے اس صورت میں ابلغ و اعلیٰ ہی کو مقدم کرتے ہیں[۲۰۴] ایسے ہی یہاں اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنا مقصود ہے۔ کہ مشتہی جنت میں مثل مدعی کے ہے ادنیٰ کو اعلیٰ کے برابر کرنا مقصود نہیں۔ کیونکہ یہ مراد کے خلاف ہے اب اشکال رفع ہو گیا۔

آگے فرماتے ہیں نزلاً کہ یہ سب کچھ بطور مہمانی کے ہوگا۔ بھک منگوں[۲۰۵] کی طرح کھانا وغیرہ نہیں دیا جائے گا بلکہ عزت و قدر دانی کے

---

(۲۰۰) شاخ (۲۰۱) ہر وہ چیز موجود ہے جس کی خواہش ہو (۲۰۲) اس برابری (۲۰۳) کو پہلے بیان کرنا (۲۰۴) اچھے اور اعلیٰ ہی کو پہلے ذکر کرتے ہیں (۲۰۵) فقیروں

ساتھ معاملہ ہوگا۔ اب جب ہر طرح سے اطمینان دلا دیا گیا تو قاعدہ یہ ہے۔ کہ اطمینان کے بعد وہم شروع ہوا کرتا ہے اور دور دور کی سوجھا کرتی ہے۔ اب جنتیوں کو یہ خیال ہوگا کہ میاں ہم تو اس قابل نہ تھے۔ نہ ہمارے اعمال اس لائق تھے۔ ہم نے تو بعضے بڑے بڑے گناہ بھی کیے ہیں کہیں ایسی نہ ہو کہ یہ معافی تھوڑی دیر کے لیے ہو۔ پھر معاصی[۲۰۶] پر گرفت ہونے لگے اس لیے فرماتے ہیں:. من غفور رحیم .

کہ گو تم اس قابل نہ تھے مگر حق تعالیٰ بخشنے والے ہیں انہوں نے تمہارے عیوب و نقائص کو معاف فرما کر یہ انعام کیا ہے۔ کیونکہ وہ بخشنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ جرم کو معاف فرما کر عنایت و رحمت بھی فرماتے ہیں۔ وہ جس مجرم کو معافی دیتے ہیں اس پر انعام بھی فرماتے ہیں خلعت و زاد راہ[۲۰۷]۔ بھی عنایت کرتے ہیں یہاں تک تو استقامت کے ثمرات کا ذکر تھا۔

طریقِ تکمیل استقامت

اور یہ اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ یہ سب مطلق استقامت کا نتیجہ ہے اور وہ عام ہے۔ خواہ استقامت بدرجہ اعلیٰ ہو یا بدرجہ ادنیٰ۔ یعنی خلاصہ یہ ہے۔ کہ نتائج نفس ایمان کے ہیں۔ مگر استقامت و ایمان اگر ادنیٰ ہے تو یہ ثمرات گو حاصل سب کے سب ہوں گے۔ مگر درجہ ادنیٰ میں حاصل ہوں گے اور اگر استقامت اعلیٰ ہے۔ تو یہ ثمرات اعلیٰ درجہ میں حاصل ہوں گے۔ اس لیے آگے اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کی ترغیب کے لیے تکمیل استقامت[۲۰۸] اور تقویت ایمان کا طریقہ اس طرز سے

---

(۲۰۶) گناہوں (۲۰۷) لباس اور سفر خرچ بھی عنایت فرماتے ہیں
(۲۰۸) استقامت کو مکمل کرنے اور ایمان کو قوی کرنے کا طریقہ

بتلاتے ہیں- چنانچہ ارشاد ہے:-

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللّٰہ و عمل صالحا وقال انني من المسلمين [۲۰۹].

اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو بلاوے طرف اللہ کے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں اس میں تکمیل ایمان کے لیے تین اجزاء مذکور ہیں- ایک دعوت الی اللہ کہ دوسروں کو بھی اللہ کی طرف بلائے امر بالمعروف کرے- یعنی لوگوں کو اسلام کی دعوت دے اور مسلمانوں کو طاعات کی ترغیب دلائے- دوسرے یہ کہ خود بھی اعمال صالحہ اختیار کرے محض نفس ایمان پر اکتفانہ کرے- تیسرے یہ کہ یوں کہے کہ میں مسلمان ہوں-

اس تیسرے جملہ پر بظاہر یہ اشکال ہوگا کہ دعا الی اللہ و عمل صالحا کے بعد اس کی کیا ضرورت رہی کیونکہ دعوت الی اللہ اور عمل صالح بدون اسلام کے ہو ہی نہیں سکتا- اسلام تو اس کے لیے پہلی شرط ہے پھر جو شخص اللہ کی طرف بلائے گا وہ خود بھی ضرور مسلمان ہوگا اس سے خود اس کا مسلمان ہونا مفہوم ہو گیا [۲۱۰]-

نیز اس سے پہلے بھی جو فضائل نفس ایمان کے مذکور ہیں- وہ بھی اسلام کو مقتضی ہیں- بدون اسلام کے نہ جنت مل سکتی ہے نہ بشارتیں حاصل ہو سکتی ہیں- تو اب وقال انني من المسلمين- کو اخیر میں کیوں بیان کیا گیا؟ اس کو تو تکمیل استقامت میں دخل ہیں- بلکہ نفس استقامت ہی اس پر موقوف ہے-

جواب یہ ہے کہ یہاں اسلام من حیث ہو الاسلام کا قبول کرنا مراد نہیں [۲۱۱]- کیونکہ واقعی یہ تو پہلے کلام سے مفہوم ہو چکا ہے- بلکہ مقصود یہ ہے کہ

---

(۲۰۹) حم سجدہ آیت ۳۳ (۲۱۰) سمجھ میں آگیا (۲۱۱) یہاں میں مسلمانوں میں سے ہوں اسلام کا وہ درجہ کہ جس کو قبول اسلام کہتے ہیں مراد نہیں

ان کو اپنے اسلام کے ظاہر کرنے سے عار نہیں آتا۔ بلکہ فخر کے پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ بات نفس اسلام سے زائد ہے۔ یہ اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ جس کا اسلام کامل ہو۔ لہذا اس کو تکمیل اسلام میں داخل ہوا کیونکہ بعض لوگ مسلمان تو ہوتے ہیں مگر ان کو کفار کے سامنے اظہار اسلام سے عار[۲۱۲] آتا ہے۔

چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ریل میں ایک بار نماز کا وقت آگیا تھا۔ مگر میں نے وہاں اس لیے نماز نہیں پڑھی کہ ہندوؤں کے سامنے اٹھا سیدھا ہونے سے اسلام کی تحقیر ہوتی۔ کہ یہ لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔ کہ اسلام میں یہ کیسی تعلیم ہے۔ یہ شیطان کی تلبیس[۲۱۳] تھی۔ کہ اس نے اس ترکیب سے ترک نماز کو اس کے ذہن میں آراستہ کر دیا ورنہ دراصل اس کو مخالفین کے سامنے عبادت کرنے سے استنکاف[۲۱۴] تھا۔ جیسا کہ بعض لوگوں کو بھرے مجمع میں یہ بات ظاہر کرنے سے عار آتی ہے کہ ہم فلاں کے شاگرد ہیں اور وہ ہمارا استاد ہے اور اگر کسی کو اس سے بھی عار نہ آئے تو اپنے معتقدین کے سامنے استاد کی خدمت سے تو ضرور عار آتا ہے۔

ایک جنٹلمین مولوی کا قصہ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ کہ ایک دفعہ انہوں نے ایک جلسہ میں تقریر کی۔ مولوی فاروق صاحب چڑیا کوٹی بھی جوان کے استاد سے تھے جلسہ میں موجود تھے۔ جب وہ مولوی صاحب تقریر کر چکے۔ تو مولوی فاروق صاحب نے ان کو پکارا کہ ارے فلانے! ذرا میرے پیر دبانا۔ اس وقت مولوی صاحب نے پیر تو دبائے مگر ان کے چہرہ سے ناگواری ظاہر ہوتی تھی۔ تو گو ان کو مولوی فاروق صاحب کی شاگردی سے انکار نہ تھا۔ مگر اس کے اظہار

(۲۱۲) شرم (۲۱۳) شیطانی دھوکہ تھا (۲۱۴) رکاوٹ تھی

سے استنکاف[۲۱۵] تھا- اسی طرح بعضوں کو اپنے اسلام کے اظہار سے عار آتا ہے-

اور اس کی فرع یہ بھی ہے کہ جن مسائل اسلامی پر ملاحدہ اعتراض کرتے ہیں - بعض مسلمان ان مسائل کے اظہار سے عار کرتے ہیں اور ان میں تاویل و تحریف کرکے اس طرح بیان کرتے ہیں- کہ مخالفین پر ان مسائل کی اصل حقیقت ظاہر نہ ہو- جیسے غلامی کا مسئلہ اور معراج کا قصہ بعضے تو ان کا صراحۃً انکار ہی کردیتے ہیں- کہ اسلام میں یہ مسائل ہیں ہی نہیں- جیسے ایک لطیفہ سنا ہے- کہ ایک مولوی صاحب سے کسی نے سرین[۲۱۶] کی عربی پوچھی ان کو معلوم نہ تھی کہتے ہیں عرب میں سرین نہیں ہوتے- اس لیے اس کی کچھ عربی نہیں- اور بعضے صراحۃً انکار نہیں کرتے لیکن اصلی صورت پر ان کو ظاہر بھی نہیں کرتے- اس لیے فرماتے ہیں-

وقال اننی من المسلمین . یعنی بندگی کے اظہار کو فخر سمجھے کہ ہم حق تعالیٰ کے ایسے تابعدار ہیں کہ سب احکام کو بلاچوں وچرا مانتے ہیں چاہے وہ عقل میں آئیں یا نہ آئیں اب اشکال رفع ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ اس قول کو تکمیل استقامت میں بڑا دخل ہے-

پس فرماتے ہیں کہ تم نے مطلق استقامت کے فضائل تو سن لیے اب اس کے بڑھانے میں کوشش کرو- جس کا طریقہ یہ ہے کہ امر بالمعروف کرو دوسروں کو اسلام کی طرف بلاؤ اور خود بھی اعمال صالحہ بجالاؤ اور اپنے اسلام کو فخر کے طور پر دل کھول کر ظاہر کرو- جس کو یہ باتیں حاصل ہوجائیں اس سے اچھی کسی کی بات نہیں-

---

(۲۱۵) اگر اس کے اظہار میں رکاوٹ تھی (۲۱۶) مقعد کو کہتے ہیں

دستور دعوت

آگے اسی کے متعلق ایک بات فرماتے ہیں جو ابھی آیت کے لیے کالجزو[۲۱۷] ہے۔ مستقل مضمون نہیں۔ وہ یہ کہ اوپر دعوت الی اللہ کا امر تھا اور دعوت الی اللہ میں بعض دفعہ کفار یا فجار ایذاء پہنچاتے ہیں اس کے متعلق ایک دستور العمل تعلیم فرماتے ہیں اور وہ تعلیم تو ادفع بالتی ھی احسن سے شروع ہوگی۔ مگر اس سے پہلے مقدمہ کے طور پر ایک قاعدہ کلیہ بیان فرماتے ہیں۔

ولا تستوی الحسنة ولا السیئة[۲۱۸] . یعنی یہ قاعدہ یاد رکھو کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوتی اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ اچھا برتاؤ اور برا برتاؤ برابر نہیں ہوتا پس تم کو دعوت میں عمدہ برتاؤ اختیار کرنا چاہئیے۔ وہ کیا ہے؟

ادفع بالتی ھی احسن . یعنی مخالفت کے برے برتاؤ کو اپنے اچھے برتاؤ سے دفع کرو۔ بدی کا علاج بھلائی سے کرو۔ اگر وہ سختی کریں تو تم نرمی کرو ان کے ساتھ خشونت[۲۱۹] سے پیش نہ آؤ۔

آگے اس کا ایک دنیوی فائدہ بتلاتے ہیں:۔

فاذا الذی بینک و بینه عداوة کانه ولی حمیم[۲۲۰]

یعنی پھر دیکھ لینا کہ تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا۔ جیسا کوئی ولی دوست ہوتا ہے۔ کانہ ولی حمیم۔ میں لفظ تشبیہ سے اس طرف لطیف اشارہ ہے۔ کہ بعض لوگ تو نرمی کرنے سے بالکل ہی دوست ہو جاتے ہیں اور بعض اگر دوست نہیں ہوتے لیکن ان کی عداوت ضرور گھٹ جاتی ہے اور شر

---

(۲۱۷) اسی آیت کے ایک جیز کی طرح (۲۱۸) حم سجدہ آیت ۳۴
(۲۱۹) غصہ سے (۲۲۰) حم سجدہ آیت ۳۴

میں تقلیل[۲۲۱] ہوجاتی ہے اور اس امر میں وہ دوست کے مشابہ ہوجاتا ہے۔ گو ولی دوست نہ ہو مگر اس میں ایک شرط ہے جس کو میں بھول گیا تھا۔ اپنی تفسیر کو دیکھا۔ تو اس میں اس تمام پر سلامت کی قید بڑھائی ہے۔ یعنی یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثریہ ہے اور مطلب یہ ہے۔ کہ اگر مخاطب کی طبیعت میں سلامتی ہوئی۔ تو اس برتاؤ کا یہ اثر ضرور ظاہر ہوگا اور یہ قید دلیل عقلی سے پائی گئی ہے۔ پس اب یہ اشکال نہ رہا۔ کہ بعض دفعہ ہم دشمن سے کتنی ہی نرمی کرتے ہیں۔ مگر عداوت بڑھتی ہی جاتی ہے جواب ظاہر ہے کہ وہ شخص کج طبع[۲۲۲] ہے۔ اس لیے اثر نہیں ہوا سلیم الطبع ہوتا، تو ضرور جھک جاتا۔

آگے فرماتے ہیں کہ بدی کا بدلہ بھلائی سے کرنا ہر ایک کو آسان نہیں۔ بلکہ یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے۔ جو بڑا مستقل مزاج اور صاحب نصیب ہے۔ یعنی جو اخلاقی اعتبار سے مستقل اور ثواب آخرت کے اعتبار سے صاحب نصیب ہے۔ اس میں اس کے معاملہ کا طریقہ بتلادیا کہ اپنے اندر استقلال کا مادہ پیدا کرو اور آخرت کے حصہ کو دل میں جگہ دو پھر یہ سب کچھ آسان ہوجائے گا۔

آگے فرماتے ہیں کہ اگر کسی وقت شیطان کی طرف سے (غصہ) وسوسہ آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجیے۔ اس میں غصہ کا علاج بتلایا گیا ہے۔ کہ غصہ کے وقت زبان سے اعوذ باللہ پڑھنا چاہیے اور دل سے اس کے مضمون پر غور کرنا چاہیے کہ جیسے ہم دوسرے پر غصہ کرتے ہیں اور اس وقت بظاہر اس پر زبردست ہیں۔ ایسے ہی ہمارے اوپر بھی ایک زبردست ہے جس کی پناہ کی ہم کو ضرورت ہے۔

اس کے بعد ایک مراقبہ کی تعلیم ہے۔ جس کے عمل کرنے سے غصہ

---

(۲۲۱) کمی (۲۲۲) بری طبیعت والا ہے

وغیرہ کا دفع کرنا بہت سہل ہوجائے گا۔

انہ ھو السمیع العلیم[۲۲۳]۔ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو خوب سننے اور تمہارے اعمال و احوال کو خوب جانتے ہیں۔ اس لیے جو بات کرو اور جو کام کرو سنبھل کر کرو۔ غصہ میں جلدی سے کچھ کام نہ کرو مبادا حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کام ہوجائے تو گرفت ہو۔

سبحان اللہ! کیسا کامل و مکمل کلام ہے جس میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت ہے حاصل بیان کا یہ ہے کہ استقامت کچھ دشوار چیز نہیں۔ ہر مسلمان کو استقامت حاصل ہوسکتی ہے بلکہ حاصل ہے اور نفس استقامت پر جن فضائل کو متفرع[۲۲۴] کیا گیا ہے ہر مسلمان کو یہ فضائل نصیب ہوں گے۔ پھر جس قدر دعوت الی اللہ اور اعمال صالحہ اور انشراح باظہار العبدیت[۲۲۵] میں ترقی ہوگی۔ اسی قدر ان ثمرات میں ترقی ہوگی۔ پھر ان ثمرات عالیہ کے لیے ترقی کی طلب کیوں نہ ہو۔ ضرور ہونا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ ترقی کے ذرائع بھی میسر ہوں۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است

خم و خم خانہ با مہر و نشاں است[۲۲۶]۔

اور اگر کسی کو نفس ایمان ہی حاصل ہو۔ وہ بھی مایوس نہ ہو۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ استقامت کا ایک درجہ اس کو بھی حاصل ہے جس سے یہ ثمرات اس کو بھی ضرور حاصل ہوں گے۔ گو ادنیٰ ہی درجہ میں سہی۔ پس ناامید تو نہ ہو مگر ادنیٰ درجہ پر قناعت بھی نہ کرے۔ بلکہ ترقی کی کوشش کرے۔ اب دعا کیجیے کہ حق

---

(۲۲۳) حم سجدہ آیت ۳۶

(۲۲۴) مطلق استقامت پر جو فضائل بیان کیے گئے (۲۲۵) اپنی بندگی کے اظہار سے طبیعت کھل جانا (۲۲۶) ابھی بھی وہ رحمت کا بادل، موتی برسا رہا ہے شراب اور شراب خانے اس کی علامت ہیں۔

تعالیٰ ہم کو استقامت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین . و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین .